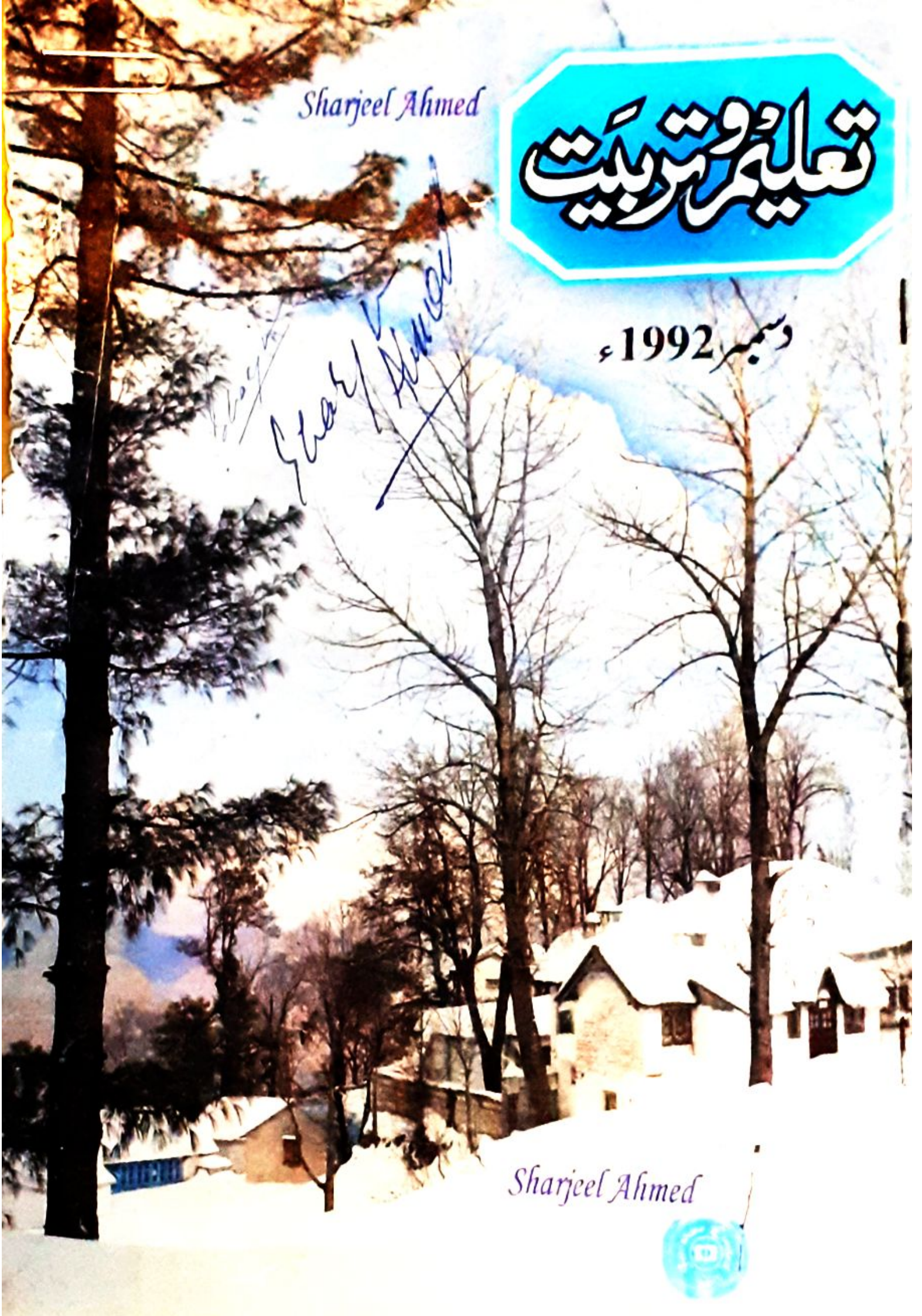

تعلیم و تربیت

دسمبر 1992ء

Sharjeel Ahmed

Sharjeel Ahmed

تعلیم و تربیت کا اگلا شمارہ

کہانی نمبر ہو گا

80 صفحات قیمت 12 روپے

ہاکر سے کہہ کر اپنی کاپی محفوظ کرا لیجیے

52 واں سال
نواں شمارہ

تعلیم و تربیت

پاکستان میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا
بچوں کا محبوب رسالہ

چیف ایڈیٹر :	عبدالسلام
ایڈیٹر :	ظہیر سلام
ایسوسی ایٹ ایڈیٹر :	سید لخت
سینیئر اسسٹنٹ ایڈیٹر :	ڈاکٹر عبدالرؤف
اسسٹنٹ ایڈیٹر :	محمد اقبال ثاقب
آرٹ ڈائریکٹر :	محمود حسن اوی
سرکولیشن اسسٹنٹ :	محمد بشیر راہی

مطبوعہ فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ لاہور

پبلشر :	ظہیر سلام
پرنٹر :	عبدالسلام

پتا
ماہنامہ تعلیم و تربیت
32- شارع بن بادیس لاہور
فون :- 361309-361310

سرکولیشن اور اکاؤنٹس
60- شاہراہ قائد اعظم لاہور

سالانہ قیمت

پاکستان میں (معہ رجسٹری کے ساتھ)	-/200 روپے
مشرق وسطی و افریقہ (ہوائی ڈاک سے)	-/250 روپے
یورپ (ہوائی ڈاک سے)	-/300 روپے
مشرق بعید (ہوائی ڈاک سے)	-/330 روپے

دسمبر
1992

قیمت فی پرچہ -/9 روپے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

السّلام علیکم

کہانی نمبر کی تیاریاں زور و شور سے جاری ہیں، اور ان شاء اللہ یہ یادگار نمبر جنوری 1993ء کی پہلی تاریخ کو آپ کے ہاتھوں میں ہو گا۔

اِس خاص نمبر میں وہ تمام ادیب حصّہ لے رہے ہیں جن کی کہانیاں آپ بہت پسند کرتے ہیں، اور آپ کو یہ جان کر خوشی ہو گی کہ جناب میرزا ادیب، ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، سیّد نظر زیدی، محترمہ ذکیہ بلگرامی، پروفیسر محمد یونس حسرت، جناب سلیم خاں گمی، ڈاکٹر رؤف پاریکھ، محترمہ رضوانہ سیّد علی، محترمہ فوزیہ طاہرہ، جناب اشفاق احمد خاں اور جناب محمد ادریس قریشی کی کہانیاں ہمیں موصول ہو چکی ہیں۔

10 صفحات بچوں کی کہانیوں کے لیے مخصوص کیے گئے ہیں۔

اِس حسین و دل کش نمبر کے صفحات 80 اور قیمت صرف 12 روپے ہو گی۔ مایوسی سے بچنے کے لیے آج ہی ہاکر یا نیوز ایجنٹ سے کہہ کر اپنی کاپی محفوظ کرا لیجیے۔

اِس شمارے میں

Sharjeel Ahmed

اداریہ		1
قائد اعظم (نظم)	ضیاء الحسن ضیا	2
انوکھا علاج (کہانی)	سیّد نظر زیدی	3
سونے کی ڈلی (کہانی)	عبدالرؤف ظفر	6
قائد اعظم اور پاکستان	ڈاکٹر نصیر احمد ناصر	9
بچوں کی سیاسی تربیت	ڈاکٹر عبدالرؤف	11
سگنل والا (کہانی)	ممتاز احمد تسنیم	13
قائد اعظم اور طالب علم		15
جوتے کی کہانی		16
آئیے، مسکرائیں		19
سردی آئی (نظم)	سرور بجنوری	20
خدا کے لیے (کہانی)	اشرف راحت	21
نفرت (کہانی)	اشفاق احمد خاں	24
کیا، کیوں، کیسے	س۔ ل	28
گندہ رومال (کہانی)	ڈاکٹر محمد رفیق	30
چور کون؟ (کہانی)	شکیل زاہد	32
فیڈ بیک (کہانی)	محمد اقبال ثاقب	37
آئیے، دوست بنائیں		39
آپ کا خط ملا		40
آپ بھی لکھیے		42
دماغ لڑاؤ علمی آزمائش		47
باتصویر معلومات		49
آپریشن سیاچن (ناول)	سلیم خاں گمی	50
ہونہار مصور		55
عظیم مسلمان	مبین الحق فرخ گوہی	56

قائدِ اعظمؒ

ضیاءُ الحسن ضیا

قائدِ اعظم تھے سچّے رہ نُما
نیک ، سیدھے اور اچھے رہنما
اُن کی ہمّت کا نہیں کوئی جواب
پیار ہے ہم سب کو اُن سے بے حساب
اپنی مِلّت کے بڑے ہمدرد تھے
کام وہ کرتے تھے سب کے واسطے
اُن کو انگریزوں نے مانا، دوستو
مُلک دِلوایا اُنھوں نے قوم کو
اُن کی حکمت اور سیاست بے مثال
قائدِ اعظم تھے کتنے با کمال
قائد اعظم کے پیارے سب اُصول
جیسے گلشن میں ترو تازہ ہوں پھول
بھول سکتے ہی نہیں اُس کو ضیاؔ
جو سبق ہم کو دیا تنظیم کا

انوکھا علاج

سید نظر زیدی

کسی گاؤں میں ایک بیوہ رہتی تھی۔ وہ بہت غریب تھی۔ محنت مزدوری کر کے اپنا اور اپنے بیٹے کا پیٹ پالتی تھی۔ غُربت میں انسان کچھ چڑچڑا اور مایوس سا ہو جاتا ہے۔ وہ خیال کرتا ہے کہ اُس کے ساتھ بے اِنصافی ہو رہی ہے اور اِسی وجہ سے اُس کی حالت ایسی بُری ہے۔ لیکن یہ خاتون ایسی نہ تھی۔ وہ بہت نیک دِل اور سمجھ دار تھی۔ سچّے دل سے اللہ پر اِیمان رکھتی تھی اور یہ جانتی تھی کہ اگر ڈھنگ سے کوشش کی جائے تو حالات سُدھارے جاسکتے ہیں۔ اِسی لیے وہ اپنے بیٹے کی تعلیم و تربیت پر بہت دھیان دے رہی تھی۔ خود روزہ رکھ لیتی، لیکن بیٹے کو جس کا نام ہدایت اللہ تھا، اچھا کھلاتی۔ اُسے گاؤں کے اِسکول میں بھی داخِل کرا دیا تھا۔

ایسی اچھی اور محبّت کرنے والی ماں کا بیٹا ہونے کی وجہ سے ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ہدایت اللہ صاحِب تعلیم حاصل کرنے میں خوب محنت کرتے اور اپنی عادتیں دُرست رکھتے، لیکن بات اِس کے بالکُل اُلٹ تھی۔ ہدایت صاحِب پرلے درجے کے بے ہدایتے تھے۔ نہ شوق سے تعلیم حاصل کرتے، نہ بھلائی کا کوئی کام کرتے۔ بس ہر وقت شرارتیں کرتے رہتے۔

اور بہت سی بُری عادتوں کے عِلاوہ اِس لڑکے میں ایک بہت ہی بُری عادت یہ تھی کہ ماں کا کہنا بالکُل نہ مانتا تھا۔ یُوں لگتا تھا جیسے اُس نے فیصلہ کر رکھا ہے کہ ماں جو کچھ کہے گی، اُس کا اُلٹ کرے گا۔

بے چاری بیوہ اپنے اِس نکمّے بیٹے کی وجہ سے بہت پریشان تھی۔ وہ تو یہ اُمید کر رہی تھی کہ میرا ہدایت اللہ پڑھ لکھ کر قابل بن جائے گا تو اُسے کوئی اچھی سی نوکری مل جائے گی اور غُربت کا عذاب ختم ہو جائے گا۔ لیکن اُس کی حالت یہ تھی کہ جیسے جیسے عُمر بڑھ رہی تھی خراب عادتیں بھی پکّی ہوتی جا رہی تھیں۔

ماں اُسے سمجھاتی "بیٹے، تم پڑھ لِکھ کر قابل بن جاؤ گے تو ساری زندگی عیش کرو گے۔ سب تمہاری عزّت کریں گے۔ تمہیں ہر طرح کا آرام ملے گا۔" مگر ہدایت میاں تھے کہ اُن کی سمجھ میں کوئی بات آتی ہی نہ تھی۔ ماں کی بات ایک کان سے سُنتے اور دوسرے سے نکال دیتے۔

بیوہ ماں اپنے بے عقل بیٹے کو سمجھا سمجھا کر تھک گئی تو اُسے خیال آیا کہیں اِس لڑکے کے دماغ میں کوئی خرابی تو نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے یہ بیمار ہو اور بیماری کی وجہ سے ایسی اُلٹی پُلٹی باتیں کرتا ہو۔ یہ سوچتے ہوئے اُسے رنج بھی ہُوا، لیکن اِس کے سِوا اور کوئی بات سمجھ میں آتی ہی نہ تھی۔ آخر مجبُور ہو کر اُس نے ہدایت کو حکیم کے پاس لے جانے کا فیصلہ کیا۔

گاؤں کے یہ حکیم صاحِب زیادہ پڑھے لِکھے تو نہ تھے، لیکن نیک اور سمجھ دار بہت تھے۔ گاؤں کا جو آدمی بھی بیمار ہوتا اُنہی سے عِلاج کراتا اور دو چار دن ہی میں بھلا چنگا ہو جاتا۔

ہدایت کی ماں اُسے حکیم صاحِب کے پاس لے گئی تو اُنہوں نے غور سے اُس کی بات سُنی، ہدایت کی نبض، زبان اور

آنکھیں دیکھیں اور پھر پیار سے اُس کی کمر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے "بیٹے، ہم نے اچھی طرح تمہارا مُعاینہ کیا ہے۔ خدا کے فضل سے تم بالکل تن دُرست ہو۔ ہاں، ایک بیماری تمہارے اندر ضرور ہے، اور وہ ہے شرارت اور بے پروائی۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ تم شرارتیں بالکل چھوڑ دو۔ بچّے شرارتیں کیا ہی کرتے ہیں، لیکن اِن میں حد سے بڑھ جانا اچھا نہیں، جس طرح تم بڑھ گئے ہو۔"

"یہ آپ سے کس نے کہا؟" ہدایت نے سوال کیا۔

"تمہاری امّی جان، کہ رہی ہیں۔ یہ تو غلط بات نہیں کہ سکتیں نا؟" حکیم صاحب نے شریر لڑکے کو سمجھانے کی کوشش کی۔

"اور یہی تو سب سے زیادہ غلط باتیں کہتی ہیں" ہدایت نے اپنی ماں کو گھورتے ہوئے کہا۔ اِس بدتمیزی پر حکیم صاحب افسوس بھری نظروں سے کچھ دیر اُس کی طرف دیکھتے رہے، پھر کسی قدر سخت آواز میں بولے "اچھا، اب تم یہاں سے جاؤ۔ معلوم ہوتا ہے تمہاری بیماری کا علاج ممکن نہیں۔"

یہ سُنتے ہی ہدایت نے چھلانگ لگائی اور تیزی سے بھاگتا ہُوا باہر چلا گیا۔ حکیم صاحب اُس کے جانے کے بعد کچھ دیر چُپ بیٹھے رہے، جیسے سوچ رہے ہوں کہ اِس بدتمیز لڑکے کا علاج کس طرح کرنا چاہیئے۔ پھر اپنے بکس سے دوا کی ایک پُڑیا نکال کر ہدایت کی ماں کو دے کر اُسے کوئی بات سمجھائی اور تاکید کی "دیکھو، بالکل اِسی طرح کرنا جس طرح ہم نے کہا ہے۔" ماں نے اُن کی باتوں پر عمل کرنے کا وعدہ کیا اور اجازت لے کر اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گئی۔

دوسرے دن ہدایت اللہ دوپہر کا کھانا کھانے بیٹھا تو اُس کی ماں نے ایک پلیٹ کو دوسری پلیٹ سے ڈھکتے ہوئے کہا "دیکھو، بیٹا، اِس پلیٹ میں جو حلوا ہے، وہ نہ کھانا۔ یہ میں نے فاتحہ کے لیے نکالا ہے۔ تمہاری پلیٹ یہ ہے۔ یہ کھاؤ اور اگر دل چاہے تو کڑاہی میں سے اور لے لینا۔" یہ کہہ کر وہ چلی گئیں۔

"اچھا جی، جو بڑھیا چیز ہے وہ فاتحہ کے لیے رکھ لی ہے" ماں کے جانے کے بعد ہدایت نے شرارت بھری آواز میں کہا اور اُس پلیٹ کا سارا حلوا کھالیا۔ پھر دسترخوان سے ہاتھ پونچھے اور بھاگتا ہُوا باہر چلا گیا۔ بدتمیز کو یہ بات بھی معلوم نہ تھی کہ دسترخوان سے ہاتھ نہیں پونچھتے۔

اُس کی ماں ذرا دیر بعد ہی آ گئی۔ حلوے کی پلیٹ خالی دیکھ کر اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ آسمان کی طرف دیکھ کر کہنے لگی "میرے اللہ! کیا میرا یہ بیٹا اِسی طرح ضِدّی اور اُلٹی باتیں کرنے والا رہے گا؟ اے میرے رب! تجھے تو معلوم ہے، دُنیا میں میرا آخری سہارا یہی ہے۔ اگر اِس کی عادتیں ٹھیک نہ ہوئیں تو میری زندگی کیسے کٹے گی؟ کچھ دن بعد تو میں اِتنی بوڑھی ہو جاؤں گی کہ مجھ سے محنت مزدوری بھی نہ ہو سکے گی۔"

اُس کی باتیں ابھی ختم نہ ہوئی تھیں کہ ہدایت ہائے ہائے کرتا ہُوا گھر میں داخل ہوا اور پلنگ پر گر کر مچھلی کی طرح تڑپنے

Sharjeel Ahmed

لگا۔ اُس کے ساتھ دو تین لڑکے بھی تھے جو اُسے سہارا دے کر گھر لائے تھے۔ ایک لڑکے نے کہا "ماں جی، ہدایت کے پیٹ میں سخت درد ہے۔ بازار میں ایک دُکان کے تخت پر پڑا تڑپ رہا تھا۔ ہم بڑی مُشکل سے یہاں لائے ہیں۔"

بیٹے کی یہ حالت دیکھ کر ماں کا تو بُرا حال ہو گیا۔ وہ روتے ہوئے بولی "بیٹا، اللہ تمہارا بھلا کرے۔ تم نے مُصیبت کے وقت میرے بیٹے کی مدد کی۔ اب اِتنی مہربانی اور کر دو کہ حکیم صاحِب کو بُلا لاؤ۔"

ایک لڑکا بولا "ماں جی، آپ فِکر نہ کریں۔ ہم ابھی حکیم صاحِب کو ساتھ لے کر آتے ہیں۔"

حکیم صاحِب اُس لڑکے کے ساتھ ہی آ گئے جو اُنہیں بُلانے گیا تھا۔ پیٹ کے درد کی وجہ سے شریر ہدایت کا بُرا حال تھا۔ حکیم صاحِب کو دیکھا تو ہاتھ جوڑ کر روتے ہوئے کہنے لگا "حکیم صاحِب، خدا کے لیے مجھے بچا لیجیے۔ میں مر جاؤں گا۔ میرے پیٹ میں سخت درد ہے۔ جان نکلی جا رہی ہے۔ بچا لیجیے مجھے حکیم صاحِب، خدا کے لیے بچا لیجیے۔"

حکیم صاحِب نے انگلیوں سے ہدایت کا پیٹ دباتے ہوئے کہا "حوصلہ رکھو۔ تم بہت بہادر ہو۔ نہ اپنی ماں کا کہنا مانتے ہو نہ کسی اور کا۔ ذرا سا درد ہو گیا پیٹ میں تو بُزدلوں کی طرح رو رہے ہو۔"

"یہ ذرا سا درد نہیں ہے، حکیم صاحِب۔ بہت تکلیف ہے مجھے۔ خدا کے لیے کوئی دوا دیجیے، ورنہ میں مر جاؤں گا۔" ہدایت نے اُونچی آواز میں روتے ہوئے کہا۔

حکیم صاحِب بولے "یہ درد دوا سے ٹھیک نہ ہو گا۔ اگر تم چاہتے ہو کہ آرام آ جائے تو اپنی والِدہ صاحِبہ سے مُعافی مانگو اور پکّا وعدہ کرو کہ آیندہ اِن کی نافرمانی نہ کرو گے اور ایک شریف بچّہ بن جاؤ گے۔ جلدی سے مُعافی مانگو!"

"اچھی امّی جان، مجھے مُعاف کر دیجیے۔ میں وعدہ کرتا ہُوں کہ آیندہ آپ کا ہر حکم مانوں گا۔ مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ میں آپ کا کہنا مانتا اور وہ حلوا نہ کھاتا جو آپ نے فاتحہ کے لیے رکھا تھا تو میرے پیٹ میں درد نہ ہوتا۔" ہدایت نے اپنی ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ درد کی وجہ سے اُس کا بُرا حال تھا۔ چہرے کا رنگ زرد ہو گیا تھا۔

حکیم صاحِب شیروانی کی جیب سے ایک پُڑیا نکالتے ہوئے بولے "اب آئے نا سیدھے راستے پر۔ لو یہ پُڑیا پانی سے کھا لو۔ خدا شِفا دے گا۔ یاد رکھو، جب بھی اپنی ماں کو ستاؤ گے، پیٹ میں اِسی طرح درد ہو جایا کرے گا۔"

ہدایت نے پُڑیا کی دوا جلدی سے مُنہ میں ڈال لی۔ ماں نے پانی کا گلاس اُس کی طرف بڑھا دیا۔ اور پھر ایسا ہُوا کہ دوا کھانے کے تین چار مِنٹ بعد ہی درد ختم ہو گیا۔ حکیم صاحِب نے مُسکرا کر اُس کی طرف دیکھا اور اُٹھتے ہوئے بولے "کیوں، برخوردار؟ یہ بات سمجھ میں آ گئی کہ تمہارے پیٹ میں درد کیوں ہُوا تھا؟"

"جی، اچھی طرح سمجھ میں آ گئی۔ میں نے اپنی ماں جان کی بات نہ مانی تھی۔ بس اِسی لیے میرے پیٹ میں اِتنا سخت درد ہُوا تھا۔ حکیم صاحِب قبلہ، میں وعدہ کرتا ہوں کہ آیندہ ایسی غلطی کبھی نہ کروں گا۔ مجھے یہ بات معلوم ہو گئی ہے کہ ماں باپ کا حکم نہ ماننے سے اللہ پاک ناراض ہو جاتا ہے"۔

"اور پیٹ کے عِلاوہ وہ کان یا سر میں بھی درد کر دیتا ہے" حکیم صاحِب نے کہا۔

بُوڑھی خاتُون اب تک یہی سمجھ رہی تھی کہ اُس کے بیٹے کے پیٹ میں درد الّم غلّم چیزیں کھانے کی وجہ سے ہُوا ہے۔ لیکن حکیم صاحِب کو مسکراتے ہوئے دیکھا تو اُس کی سمجھ میں اُس پُڑیا کا راز آ گیا جو حکیم صاحِب نے حلوے میں مِلانے کے لیے دی تھی۔ اب وہ بھی مسکرا رہی تھی اور کہہ رہی تھی "واہ! حکیم صاحِب۔ آپ نے اِس ضِدّی اور شریر لڑکے کا خوب عِلاج کیا!"

اُدھر ہدایت دل میں پکّا اِرادہ کر چکا تھا کہ اب وہ نیک بچّہ بن جائے گا اور وہ کام ہرگز ہرگز نہیں کرے گا جس سے اُس کی امّی جان رو کیں گی۔

سونے کی ڈلی

عبدالرؤف ظفر

رات کا کھانا کھا کر ہم اپنے بستر پر لیٹے تو عذرا نے کہا "ابّا جان، آج کوئی اچھی سی کہانی سُنائیں۔"

دوسرے بچّوں نے بھی اُس کی ہاں میں ہاں مِلائی۔ ابّا جان نے مسکراتے ہوئے کہا "بھئی، جو کہانیاں مجھے یاد تھیں، وہ سب تمہیں سُنا دی ہیں۔ اب تمہاری باری ہے۔"

"ہمیں تو کوئی بھی یاد نہیں" عذرا نے کہا۔

"اچھا تو پھر مجھے سوچنے دو" ابّا جان بولے "شاید کوئی یاد آ جائے۔"

تھوڑی دیر کے لیے خاموشی چھا گئی۔ پھر ابّا جان نے کہا "کہانی تو کوئی یاد نہیں آتی۔ کہو تو آج ایک آپ بیتی سُنا دُوں۔"

"چلیے، آپ بیتی ہی سہی" میں نے کہا "بعض سچّی باتیں کہانیوں سے زیادہ دِل چسپ ہوتی ہیں۔"

ابّا جان نے کچھ دیر سوچا، پھر گلا صاف کر کے بولے "تمہیں معلوم ہے کہ تین برس پہلے مُلازمت کے سِلسِلے میں مَیں کچھ دن کراچی میں رہا تھا۔ یہ اُنہی دنوں کا واقعہ ہے۔ ایک دفعہ رات کے وقت میں سائیکل پر جا رہا تھا کہ اچانک پیچھے سے آواز آئی "بابُو صاحِب ــــ!" میں نے مُڑ کر دیکھا۔ ایک نوجوان دوڑتا ہُوا آ رہا تھا۔ نزدیک آ کر کہنے لگا "بابُو صاحِب، میں نے آپ کو تکلیف دی۔ مُعافی چاہتا ہُوں۔ دراصل میں یہ پُوچھنا چاہتا ہُوں کہ کیا یہ سڑک ایمپرس مارکیٹ جاتی ہے؟"

"جی ہاں ــــ" میں نے جواب دیا۔

"اُس نے میرا شکریہ ادا کیا اور میں دوبارہ سائیکل پر سوار ہو گیا۔ لیکن ابھی تھوڑی دُور ہی گیا تھا کہ پھر اُس نے آواز دی "بابُو صاحِب! ذرا ٹھہریے!" مجھے پھر ٹھہرنا پڑا۔ نزدیک آ کر اُس نے کہا "میں اِس شہر میں اجنبی ہوں۔ اگر آپ کو تکلیف نہ ہو تو تھوڑی دُور میرے ساتھ چلیے۔ آپ بھی شاید اُدھر ہی جا رہے ہیں۔" میں رضامند ہو گیا، کیوں کہ مجھے اِتنی جلدی نہ تھی۔

"وہ چہرے سے ایک بھولا بھالا دیہاتی معلوم ہوتا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی گٹھری تھی اور دوسرے میں ڈنڈا۔ راستے میں اُس نے کوئی بات نہ کی۔ ہم جلد ہی ایمپرس مارکیٹ کے نزدیک پہنچ گئے۔

Sharjeel Ahmed

"یہاں ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ ہم اپنے خیالوں میں مگن جا رہے تھے، سڑک پر آمدورفت کم تھی کیوں کہ سردیوں کے دن تھے اور رات کے نو بجے کا وقت۔ اچانک میری نظر ایک چمکیلی سی چیز پر پڑی جو سڑک کے بیچوں بیچ پڑی تھی۔ میں ابھی دیکھ ہی رہا تھا کہ اتنے میں ایک نوجوان بڑی تیزی سے آیا اور وہ چیز اِس طرح اُٹھا کر لے گیا جیسے چیل زمین سے گوشت کا ٹکڑا اُٹھاتی ہے۔ میں تو حیرت سے اُسے دیکھتا ہی رہ گیا مگر میرے ساتھی نے شور مچا دیا "بابُو جی! وہ چور کوئی چیز اُٹھا کر لے گیا! ہمیں اُس کا تعاقب کرنا چاہیئے۔ ضرور کوئی قیمتی چیز ہو گی۔"

میں نے کہا "کرنا تو چاہیئے مگر اب تو وہ کہیں کا کہیں پہنچ چکا ہو گا۔"

"آپ مجھے سائیکل پر بٹھائیں اور اِس دائیں طرف والی گلی میں مُڑ جائیں۔ وہ اِدھر ہی گیا ہے۔ ہمارے پاس سائیکل ہے۔ ہم ضرور اُسے پکڑ لیں گے۔"

"میں نے اُسے سائیکل پر بٹھایا اور اُس گلی میں داخل ہو گیا۔ یہ گلی سڑک سے بھی زیادہ سُنسان تھی۔ ہم سیدھے چلتے گئے۔ اچانک اجنبی نے جوش بھری آواز میں کہا "وہ رہا، بابو صاحِب!"

"وہ شخص بڑی بے فکری سے ٹہلتا ہُوا جا رہا تھا۔ میں نے اُس کے قریب جا کر سائیکل روکی۔ اِس سے وہ کچھ پریشان سا ہو گیا اور بولا "فرمایئے، آپ کو مجھ سے کچھ کام ہے؟"

"ہم پولیس کے آدمی ہیں" میرے ساتھی نے کہا "بولو، ابھی ابھی سڑک پر سے تم نے کیا چیز اُٹھائی تھی؟"

"آپ کو غلطی ہوئی ہے" اُس شخص نے کہا "جایئے۔ اپنا کام کیجیے۔"

"ٹھہرو۔ ہم کام کرتے ہیں" میرے ساتھی نے ذرا غُصّے سے کہا "بابُو صاحِب، ذرا اِس کی تلاشی لینا۔ ٹھہرو — میں خود لیتا ہُوں۔"

یہ کہہ کر اُس نے اُس کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور وُہی چمکتی ہوئی چیز نکال لی۔

"بابُو صاحِب! یہ سونا — یہ سونا ہے — ہیں پچیس تولے سے کم نہیں ہو گا۔"

میں دل ہی دل میں اپنے اجنبی دوست کی چالاکی کی داد دے رہا تھا مگر جب میں نے اُس نوجوان چور کو دیکھا تو حیران رہ گیا کیوں کہ اُس کے چہرے پر پریشانی کے آثار نہ تھے۔

"بابو جی، تھانہ کہاں ہے؟" میرے ساتھی نے مجھ سے پوچھا۔

"یہ سُنتے ہی نوجوان چور گھبرا گیا۔ اُس نے نہایت عاجزی سے کہا "بابو صاحِب، میں بہُت غریب ہوں۔ مجھ پر رحم کرو۔ میں قسم کھاتا ہوں۔ میں نے چوری نہیں کی۔ مجھے سونے کی یہ ڈلی سڑک پر ملی تھی۔ اگر آپ چاہیں تو آدھا حِصّہ لے سکتے ہیں۔"

میرے ساتھی نے کہا "بدمعاش! تم چور ہو۔ ہم تمہیں آدھا حصّہ نہیں دے سکتے۔ البتہ کچھ رقم لے لو۔"

"میرا حق تو سارا ہے" نوجوان نے کہا "اگر آپ کی مرضی ہو تو کچھ رقم ہی دے دیجیے۔"

"میرا اجنبی ساتھی اُسے ایک طرف لے گیا اور وہ دونوں باتیں کرنے لگے، جیسے سودا چُکا رہے ہوں۔ کچھ دیر بعد میرا اجنبی دوست میرے پاس آیا اور بولا "بابو صاحِب، مُعاملہ طے ہو گیا۔ اب یہ سونا آپ کا ہے" اور پھر اُس نے بہت آہستہ سے کہا "آپ کے پاس کچھ رقم ہے؟"

"میں نے اپنی جیب کو ٹٹولا اور پھر تمام چیزیں اُس کے سامنے رکھ دیں — ایک پارکر پن، تیس روپے نقد اور کچھ کاغذات وغیرہ۔ اُس نے کاغذات مجھے دیتے ہوئے کہا "بابو صاحِب، یہ رقم تو بہت تھوڑی ہے۔ آپ سوچ لیں۔ یہ سونے کی ڈلی بہت قیمتی ہے۔"

یہ کہہ کر اُس نے سر سے پاؤں تک مجھے دیکھا اور پھر خوش ہو کر بولا "آہا! بابو، صاحِب! — آپ بہت خوش قسمت ہیں۔ آپ کے پاس گھڑی بھی تو ہے۔ یہ کیوں نہیں دے دیتے۔"

"مجھے سونے کا لالچ تھا۔ میں نے اپنی گھڑی بھی اُسے اُتار کر دے دی۔ میرا اجنبی دوست یہ چیزیں اُس نوجوان کے پاس لے گیا اور تھوڑی دیر بعد واپس آ کر افسُردہ لہجے میں کہنے لگا "بابو صاحِب، وہ نہیں مانتا۔ آپ کی اُنگلی میں یہ جو انگوٹھی ہے، یہ بھی دے دیں۔ آپ اِس سونے سے بیس گُنا اچھی بنوا لینا۔" اور اُس نے میرے ہاتھوں میں سونے کی ڈلی تھما دی۔ خوشی کے مارے میرا دِل بلّیوں اُچھلنے لگا۔ میں نے اپنی انگوٹھی اُسے دے دی اور سونے کی ڈلی جیب میں ڈال لی۔

"وہ اُسے انگوٹھی دے کر جلدی سے واپس آیا اور مجھ سے ہاتھ ملا کر کہنے لگا "بابو صاحِب، یہ واقِعہ آپ کو مُدّتوں یاد رہے گا۔ اچھا، میں چلتا ہوں۔ خدا حافِظ!" اور میرا پتا پوچھے بغیر وہ ایک گلی میں گھُس کر اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

"میں اُس سونے کو پا کر خوشی سے پُھولا نہ سماتا تھا۔ گھر آتے ہی میں نے ٹرنک میں کپڑوں کے نیچے اُسے چھپا دیا اور تمام رات اُس کو خرچ کرنے کے منصوبے بناتا رہا — خدا خدا کر کے سویرا ہُوا، میں دفتر گیا اور واپس آتے ہی وہ سونے کی ڈلی لے کر جوہری کی دُکان پر گیا۔ جوہری نے اُسے کسوٹی پر گھِسا اور ایک دم ہنس پڑا۔

"میں نے ذرا غصّے سے کہا "سیٹھ صاحِب، آپ بے فکر رہیں۔ یہ خالص سونا ہے۔"

"مگر — مگر —" جوہری نے رُکتے ہوئے کہا۔

"مگر کیا —؟" میں نے پوچھا۔

"بابُو صاحِب — یہ سونا نہیں" وہ بولا۔

"کیا کہا؟ — یہ سونا نہیں؟" میں نے کُرسی سے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں" جوہری نے کہا "یہ سونا نہیں بلکہ پیتل ہے، جس پر مُلمع کیا ہُوا ہے۔"

"پیتل —؟" میں نے کہا اور دھڑام سے کُرسی پر گر پڑا۔

جوہری نے جلدی سے پانی منگوا کر مجھے پِلایا اور جب ہوش آیا تو میں نے اُسے تمام کہانی سُنائی۔

وہ کہنے لگا "بابو صاحِب، معلوم ہوتا ہے، آپ کراچی میں پہلی مرتبہ آئے ہیں۔ یہاں ایسے ایسے عیّار اور مکّار چور اور ٹھگ ہیں جو آنکھوں کا سُرمہ بھی چُرا لیتے ہیں۔ اب آپ صبر کریں کیونکہ اِس کے سِوا چارہ نہیں۔ اگر آپ یہ واقِعہ کسی کو بتائیں گے تو وہ اُلٹا آپ پر ہنسے گا۔"

میں نے کہا "مجھے تو اُس اجنبی پر حیرت ہوتی ہے۔ غضب کی ایکٹنگ کی اُس نے۔ اچھا، میں چلتا ہوں"۔

جوہری نے ہاتھ مِلاتے ہوئے کہا "آیندہ ذرا اِحتیاط کیجیے گا۔"

"میں پیشانی کا پسینا پونچھتے ہوئے دُکان سے باہر نکل آیا۔"

"کہو، بچّو، پسند آئی کہانی؟" ابّا جان نے پوچھا۔

"بڑی اچھی تھی" ہم نے کہا "کہانی کی کہانی اور نصیحت کی نصیحت۔"

Sharjeel Ahmed

دانائی کی باتیں

سُنہری چڑیا

قائدِ اعظمؒ اور پاکستان

ڈاکٹر نصیر احمد ناصر

سُنہری چڑیا نے کہا:

پیارے بچّو، اِس تاریخی واقعے کو کہاوت بنالو کہ "محمّد علی جناحؒ نے پاکستان بنایا تو پاکستان نے اُن کو قائدِ اعظم اور عظیم انسان بنا دیا۔"

آپ کو یہ معلوم ہی ہو گا کہ مسلمانوں نے جان و مال کی بہت زیادہ قربانیاں دے کر پاکستان بنایا تھا۔ یہاں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ ہم نے پاکستان بنایا کیوں تھا؟ یہ بہت اہم سوال ہے اور اس کے جواب سے ہر پاکستانی کو (بچّہ ہو یا جوان، مرد ہو یا عورت) بخوبی آگاہ ہونا انتہائی ضروری اور لازمی ہے۔

بچّو، آپ کو اپنی تاریخ کے اس اہم واقعے کو یاد رکھنا چاہیے کہ آپ کے باپ دادا برِّصغیرِ پاک و ہند میں تقریباً آٹھ سو سال حکومت کر چکے ہیں۔ یہ انگریز تھے جو تاجر بن کر ہندوستان میں آئے اور اُنہوں نے ہندوؤں سے ساز باز کر کے اور قوم فروش مسلمانوں کو اپنے ساتھ ملا کر رفتہ رفتہ مسلمانوں سے حکومت چھین لی۔ انگریزوں نے تقریباً ڈیڑھ سو برس ہندوستان میں حکومت کی۔ ان کی حکمتِ عملی یہ تھی کہ مسلمانوں کو سیاسی، اقتصادی اور تعلیمی ہر لحاظ سے کمزور اور اپنا اور ہندوؤں کا محتاج بنا کر رکھا جائے۔

دوسری جنگِ عظیم کے بعد جب انگریزوں کی سلطنت کو زوال آیا اور محکوم قومیں اپنی آزادی کے لیے جدّوجُہد کرنے لگیں تو ہندوؤں اور مسلمانوں نے بھی آزادی حاصل کرنے کے لیے تحریکیں چلائیں۔ ہندوؤں کی جماعت آل انڈیا کانگرس تھی اور مسلمانوں کی سب سے بڑی جماعت آل انڈیا مسلم لیگ تھی۔ ہندوؤں کی تحریک کا مقصد یہ تھا کہ ہندو سارے ہندوستان پر حکومت کریں اور اِس طرح مسلمانوں کو اپنا محکوم و غلام بنا کر ان سے اپنی آٹھ صدیوں کی محکومی کا بدلہ لیں۔ مسلم رہنماؤں نے ہندوؤں کی نیّت کو بھانپ لیا اور انہوں نے اپنے لیے ایک آزاد و خود مختار مملکت کا مُطالبہ کیا، اُس کے حصول کے لیے تحریکِ پاکستان چلائی اور محمّد علی جناحؒ کو اپنا قائد بنالیا۔

بچّو، محمّد علی جناح ہندوستان کے بہت بڑے قانون دان اور دانا و بینا انسان تھے۔ وہ مسلمانوں کے سچّے ہمدرد اور عالی ہمّت اِنسان تھے۔ وہ ہندوؤں اور انگریزوں کی ہر چال کو سمجھتے تھے۔

بچّو، اب میں آپ کو کھول کر بتاتی ہوں کہ ہندوؤں کے حسد، کینہ اور تعصّب کے ہاتھوں مسلمانوں کی کیا حالت تھی۔ ہندو اپنے آپ کو پاک اور مسلمانوں کو پلید سمجھتے تھے، اور اب بھی سمجھتے ہیں۔ چُناں چہ وہ مسلمانوں کے ہاتھ کی کوئی چیز

کھاتے پیتے نہ تھے۔ اگر کسی چیز کو مسلمان کا ہاتھ بھی لگ جاتا تو وہ اُس چیز کو پلید سمجھ کر پھینک دیتے تھے۔ دوسرے لفظوں میں، وہ مسلمانوں کو اچھوت سمجھتے تھے۔ لیکن اپنی ذہنیت اور مذہبی عقیدے کے باوجود مسلمانوں اور دنیا کو دھوکا دینے کی خاطر یہ پراپیگنڈہ کرتے تھے کہ ہندو اور مسلمان دو قومیں نہیں، ایک قوم ہیں۔

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ ہندو مُشرک اور بُت پرست ہیں، جبکہ مسلمان مُوحّد یعنی توحید کے عَلم بردار ہیں۔ پھر وہ اور ہندو ایک قوم کیسے ہو سکتے تھے؟ چُنانچہ اُنہوں نے قائدِاعظم کی قیادت میں دو قومی یعنی جُداگانہ قومیّت کا نعرہ لگایا اور اِس بنا پر اپنے لیے آزاد پاکستان کا مُطالبہ کیا۔

ہندوؤں نے مسلمانوں کا خاموش تجارتی بائیکاٹ کیا ہوا تھا اِس لیے وہ مسلمان تاجروں یا دُکانداروں سے چیزیں نہیں خریدتے تھے۔ اِس کا نتیجہ یہ تھا کہ مسلمان تجارت میں ہندوؤں سے بہت زیادہ پس ماندہ تھے۔ غریبی کی وجہ سے سارے مسلمان اپنے بچّوں کو تعلیم نہیں دلا سکتے تھے، اِس لیے مسلمان بچّوں کی بھاری اکثریّت اَن پڑھ اور بے ہُنر رہتی تھی۔ اعلیٰ عُہدوں پر ہندو فائز تھے اور مسلمان زیادہ سے زیادہ کلرک بن سکتے تھے۔ ہندوؤں کے اِقتصادی بائیکاٹ کے سبب مسلمان صنعت کار نہیں بن سکتے تھے، یعنی کوئی فیکٹری یا کارخانہ نہیں لگا سکتے تھے۔ الغرض، ہندوؤں نے مسلمانوں پر ترقّی کی ہر راہ بند کر دی تھی۔ اِس کے نتیجے میں وہ متعصّب اور دشمن ہندوؤں کے دست نگر یا محتاج بن گئے تھے، اور ہندو اُن کو اپنا محکوم سمجھتے تھے۔

بچّو، دُنیا کو دھوکا دینے کی خاطر ایک طرف تو ہندو یہ کہتے تھے کہ ہندو اور مسلمان ایک قوم ہیں اور ان کی تہذیب یا کلچر بھی ایک ہے اور دوسری طرف اُنہوں نے مسلمانوں کا سماجی بائیکاٹ بھی کیا ہُوا تھا۔ وہ اپنے بچّوں کو مسلمان بچّوں کے ساتھ میل جول رکھنے اور کھیلنے نہیں دیتے تھے۔ انہیں مسلمانوں کے محلّوں اور گلی کوچوں میں جانے کی اجازت نہ دیتے تھے۔ وہ انہیں ڈراتے رہتے تھے کہ مسلمان آدم خور ہیں۔ اُنہیں کھا جائیں گے۔

اُردو زبان جو ہندوستان میں پیدا ہوئی تھی اور اِس ملک میں اس نے نشو و نما پائی تھی، ہندوؤں کو اِس سے سخت نفرت تھی۔ ان کا منصوبہ تھا کہ آزادی ملنے کے بعد وہ سارے ہندوستان میں ہندی رائج کریں گے اور اردو زبان کو مٹا دیں گے۔ نیز مسلمانوں کو ہندی بولنے اور لکھنے پر مجبور کر دیں گے۔ اِس طرح وہ مسلمانوں کے ادب اور کلچر کو تباہ کرنا چاہتے تھے۔

علاّمہ اقبال" اور قائدِ اعظم" ہندو قوم کے منصوبوں اور چالوں سے خوب واقف تھے۔ انہوں نے سوچا اور اِس نتیجے پر پہنچے کہ مسلمان اِسی صورت میں ہندوؤں کی غلامی اور ان کے مظالم سے محفوظ رہ سکتے ہیں، اگر اُن کا اپنا ایک الگ آزاد اور خود مختار ملک ہو۔ سب سے پہلے اِس آزاد مملکت کا نعرہ اِلٰہ آباد میں علاّمہ اقبال" نے لگایا اور مسلم لیگ نے اس کے لیے تحریک چلانے کا فیصلہ کیا۔ علاّمہ اقبال نے قائدِ اعظم" سے درخواست کی کہ وہ اس تحریک کی قیادت کریں۔ قائدِ اعظم" نے قوم و دین کی خاطر یہ درخواست قبول کر لی۔ پھر اس زور سے تحریکِ پاکستان چلائی کہ ہندو اور انگریز دونوں ششدر رہ گئے۔ اِس تحریک میں بڑوں نے ہی نہیں، عورتوں، طالبِ علموں، حتیٰ کہ بچّوں نے بھی بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔

"لے کے رہیں گے پاکستان" سب کا نعرہ تھا۔ علاّمہ اقبال" نے اپنی نظموں اور قائدِ اعظم" نے اپنی تقریروں کے ذریعے مسلمانوں کو مُجاہد اور سرفروش بنا دیا۔ اُن کے شوقِ جہاد کو دیکھ کر ہندو رہنما اور انگریز حکمران مسلمانوں کے مطالبے کو ماننے پر مجبور ہو گئے۔

آخر 14 اگست 1947ء کو پاکستان بن گیا اور قائدِ اعظم" اِس کے پہلے گورنر جنرل مقرر ہوئے۔ ساری دنیا نے ان کی قیادت کو تسلیم کر لیا۔ الغرض قائدِ اعظم" نے پاکستان بنایا تو پاکستان نے اُن کو عظیم انسان اور قائدِ اعظم" بنا دیا۔

Sharjeel Ahmed

بچوں کی سیاسی تربیت

ہماری سیاست میں ایک شدید طوفانِ بے تمیزی برپا ہے۔ گالی گلوچ، ہاتھا پائی، مار کٹائی، بھوک ہڑتال، غلط بیانی، اشتعال انگیزی، الزام تراشی ہماری سیاسی زندگی کا امتیازی نشان بن چکے ہیں۔ جلسے جلوس، مظاہرے، ہنگامے اور ہڑتالیں عام ہو گئے ہیں۔ کالجوں سکولوں میں جو طلبہ "سیاست" میں حصّہ لیتے ہیں وہ آئے دن بسیں جلانے اور تعلیم و تدریس سے غفلت برتنے کے مُرتکب ہو رہے ہیں۔ شریف لوگ ایسے ہنگاموں سے پہلے ہی تنگ ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا بچّوں کو سیاست میں حصّہ لینا چاہیئے؟ ان سب باتوں کے باوجود صحیح جواب پھر بھی یہی ہے کہ بچّوں کو سیاست میں حصّہ لینا چاہیئے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ جن بظاہر "سیاسی" باتوں کا اُوپر ذکر ہوا ہے وہ واقعی بُری ہیں۔ مگر ان کا سیاست سے دور کا بھی تعلّق نہیں ہے۔ صحت مند سیاست کا مطلب ہے کسی ملک کو اچھے طریقے سے چلانا اور اسے تعمیر و ترقی کے زینے طے کرانے کے لئے اچھی سوچ اور اچھے اعمال کا پرچار کرنا۔ ملک میں تجارت کیسے پھلے پھولے، کارخانوں کا جال کیسے بچھے، تعلیم و تحقیق کی شمع کیسے روشن ہو، جہالت و غربت کا خاتمہ کیسے ہو، گندگی اور بیماریوں کا علاج کیسے ہو، جرائم اور بُرے کِردار پر قابو کیسے پایا جائے ـــــ غرضیکہ کسی ملک اور اس کے لوگوں کے لئے سیدھے راستے پر چلنے اور مہذّب زندگی بسر کرنے کے لئے تعمیری طریقے اختیار کرنے کی مختلف کوششوں کا نام ہی اصل سیاست ہے۔ اس کے برعکس تخریب و تباہی سیاست نہیں، شیطانی فعل ہے۔

اب اگر صحیح سیاست یہ ہے تو پھر بچّوں کی سیاسی تربیت ابتدائی عمر ہی سے شروع ہو جانی چاہئے تاکہ وہ شروع زندگی ہی سے اچھا سوچیں اور اچھا کریں۔ وہ اچھے بچوں سے دوستی رکھیں۔ بدوں سے دور رہیں۔ اپنے گھر، محلّہ اور مدرسہ میں مہذّب بچوں کی طرح زندگی بسر کرنا سیکھیں۔ ہر اچھی بات میں حصّہ لیں اور ہر بُرے کام کی مخالفت کریں۔

اِس قسم کے طرزِ عمل ہی سے ہمارے بچے جوان ہو کر ہماری سیاسی زندگی میں ایک خوشگوار انقلاب لانے کے قابل ہو سکتے ہیں۔

سگنل والا

ممتاز احمد تسنیم

ہم اپنی جیپ کار میں پہاڑ سے واپس آ رہے تھے۔ جیپ درمیانی رفتار سے ڈھلواں سڑک پر پھسل رہی تھی اور ہم ہوا سے بچنے کے لیے کوٹ کے کالر اُوپر اُٹھائے سرسبز پہاڑوں اور زعفران کے خوب صورت کھیتوں کو دیکھ رہے تھے۔ اچانک جیپ ایک جھٹکے سے رُکی اور ڈرائیور نے اِعلان کیا کہ کوئی پُرزہ خراب ہو گیا ہے۔ ہم نے تھرماس سے چائے نکال کر پینی شروع کر دی اور ڈرائیور انجن کھول کر اُس کی خرابی دیکھنے لگا۔

سورج پہاڑوں کے پیچھے چھُپ رہا تھا اور سردی بڑھتی جا رہی تھی۔

میں نے ڈرائیور سے پوچھا "کیوں بھئی، کیا خرابی ہے؟"

وہ بولا "ریڈی ایٹر لیک کرتا ہے اِس لیے اب گاڑی آگے نہیں جائے گی۔"

یہ سُن کر ہم گھبرا گئے اور سوچنے لگے کہ اگر یہاں رات کاٹنی پڑی تو ہماری قُلفی جم جائے گی۔ اچانک مجھے یاد آیا کہ یہاں سے تھوڑی دُور ایک چھوٹا سا ریلوے اِسٹیشن ہے۔ کیوں نہ وہاں جا کر رات گزاریں۔ کم از کم اِس سردی سے تو بچ جائیں گے۔ سڑک کافی ڈھلواں تھی اور ہم جیپ کو وہاں چھوڑنا نہیں چاہتے تھے اس لیے میرے کہنے پر سب جیپ میں بیٹھ گئے۔ میں نے گاڑی کو زور سے دھکا لگایا اور پھر کُود کر اندر بیٹھ گیا۔ جیپ آہستہ آہستہ سرکنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد ہم اِسٹیشن کے قریب پہنچ گئے۔

اِسٹیشن ماسٹر کو ہم نے اپنی مجبوری بتائی اور درخواست کی کہ ہمیں صرف رات گزارنے کے لیے تھوڑی سی جگہ دے دے۔ بے چارہ کوئی بھلا مانس تھا۔ اُس نے نہ صرف سونے کے لیے ایک کمرا دیا بلکہ ایک دہکتی ہوئی انگیٹھی بھی لا کر رکھ دی جس پر چائے کے لیے پانی چڑھا ہوا تھا۔

کمرے میں اِسٹیشن ماسٹر کے علاوہ اَدھیڑ عُمر کا ایک سگنل مَین بھی تھا۔ اِسٹیشن ماسٹر نے باتوں باتوں میں بتایا کہ یہ سگنل مین بہت اچھا آدمی ہے اور اُس نے زندگی میں کئی کارنامے کیے ہیں۔

گرم گرم چائے ہمارے حلق سے اُتری تو ہمیں ہوش آیا۔ میں نے سگنل مَین سے کہا "چچا، آپ اپنی زندگی کا کوئی ایسا واقعہ سُنائیے جسے آپ ناقابلِ فراموش سمجھتے ہوں۔"

وہ بولا "یُوں تو میری پُوری زندگی حیرت انگیز باتوں سے بھری پڑی ہے لیکن ایک واقعہ ایسا ہے جسے میں تمام عُمر نہیں

Sharjeel Ahmed

بھول سکتا۔ یہ واقعہ حال ہی میں پیش آیا تھا۔ " ہم نے اپنی کرسیاں آگے گھسیٹ لیں اور شوق بھری نظروں سے اُسے تکنے لگے۔

اُس نے گلا صاف کیا اور بولا " میں بچپن ہی میں ریلوے میں مُلازِم ہو گیا تھا۔ پہلے تو اِنجنوں کی صفائی وغیرہ کرتا رہا، بعد میں سِگنل گرانے اور اُٹھانے کا کام سیکھ لیا۔ مجھے شروع ہی سے ہرے بھرے پہاڑوں سے پیار ہے۔ شاید اِس کی وجہ یہ ہے کہ میں کشمیر میں پیدا ہوا تھا۔ میں نے اپنے چھوٹے سے گھر میں ایک چھوٹا سا باغ لگا رکھا تھا۔ کام سے فارغ ہو کر جب گھر آتا تو میرا باقی وقت اُسی باغ کی دیکھ بھال میں بسر ہوتا۔

" جب میں نے سِگنل کا کام سیکھ لیا تو مجھے کراچی لائن پر لگا دیا گیا۔ وہ ایک چھوٹا سا اِسٹیشن تھا، جہاں نہ تو پہاڑ تھے اور نہ جھیلیں، اِس لیے میں جلد ہی اُکتا گیا اور درخواست کی کہ مجھے کسی پہاڑی اِسٹیشن پر لگا دیا جائے۔ افسر میرے کام سے خوش تھے اِس لیے اُنھوں نے بغیر کسی حُجّت کے میری تبدیلی یہاں کر دی۔ یہاں پہنچ کر میں بہُت خوش ہُوا کیوں کہ یہاں ہرے بھرے پہاڑ ہیں اور موسمِ بہار میں رنگ برنگے پھول کثرت سے کِھلتے ہیں۔ اِس کے عِلاوہ ہوا میں زعفران کی ہلکی ہلکی خوش بو ہر وقت رچی رہتی ہے۔ یہ کوئی بڑا اِسٹیشن نہیں ہے، لیکن پھر بھی سِگنل والے کی ایک اُونچی کیبن تھی۔

میں اُس کیبن میں بیٹھا دُور دُور کے نظارے کرتا اور جب کوئی ریل آتی تو اپنے سامنے لگے ہوئے "لیور" کو دبا کر سِگنل ڈاؤن کر دیتا اور گاڑی شور مچاتی ہوئی گزر جاتی جیسے وہ راستہ مِل جانے پر بہُت خوش ہو۔

" مجھے ایکسپریس گاڑی کی سیٹی بڑی اچھی لگتی تھی۔ اکثر میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی کہ سِگنل نیچے نہ گراؤں اور ایکسپریس کے اِنجن کی سیٹی سُنتا رہوں۔ لیکن مجھے ایسا کرنے کا اِختیار نہیں تھا، کیوں کہ بغیر وجہ کے اِتنی بڑی گاڑی روکنا بہُت بڑا جُرم ہے اور میں یہ جُرم کر کے اپنی نوکری سے ہاتھ دھونا نہیں چاہتا تھا۔

" یہاں سے اُوپر کی طرف ایک میل کے فاصلے پر ایک بہُت چھوٹا سا اِسٹیشن ہے، جہاں نہ تو ایکسپریس رُکتی ہے اور نہ مُسافر گاڑیاں۔ وہاں صرف سیمنٹ، لکڑی اور پتھر سے بھری ہوئی گاڑیاں جاتی ہیں، کیونکہ اُس کے قریب ہی ایک کارخانہ بن رہا ہے۔ اُس اِسٹیشن سے ہمارے اِسٹیشن تک مُسلسل ڈھلان ہے۔

" ایک دن میں اپنی کیبن میں بیٹھا دُور اُڑتے ہوئے اُودے بادلوں کو دیکھ رہا تھا کہ ایک دم ایسی آواز آئی جیسے کوئی گاڑی تیزی سے اِس طرف آ رہی ہو۔ لیکن میں نے اُسے اپنا وہم سمجھا اور پلیٹ فارم پر کھڑی مسافر گاڑی کو دیکھنے لگا جس کے مسافر اُتر کر اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ شاید اگلے اِسٹیشن سے لائن صاف ہونے کا پیغام ابھی تک نہیں پہنچا تھا۔ اسی لیے یہ گاڑی روانہ نہیں ہوئی تھی۔

" اِتنے میں اِسٹیشن ماسٹر بھاگا ہُوا آیا۔ وہ سخت گھبرایا ہُوا تھا۔ اُس نے بتایا کہ اگلے اِسٹیشن سے سیمنٹ اور پتھر کے دس ڈبّے پٹڑی پر لُڑھک گئے ہیں اور تیزی سے اِس طرف آ رہے ہیں۔

میں نے پوچھا " آپ کو کیسے اِطّلاع ملی " ؟

وہ بولا " ابھی ابھی ٹیلیفون پر خبر آئی ہے۔ خدا کے لیے کچھ کرو۔ اُن ڈبّوں میں دو سو ٹن وزن لدا ہُوا ہے اور ڈبّوں کا وزن الگ ہے۔ "

" اچانک مجھے خیال آیا کہ یہاں تو صرف ایک ہی لائن ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ اگر وہ ڈبّے اِس لائن پر آ کر پلیٹ فارم پر کھڑی گاڑی سے ٹکرا گئے تو سینکڑوں جانوں کا نُقصان ہو گا۔ اب کیا کرنا چاہیے!

" میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ مجھے موڑ مُڑتے ہوئے ڈبّے نظر آئے۔ وہ بہُت تیزی سے اِسٹیشن کی طرف آ رہے تھے۔ یکایک مجھے کیبن کے قریب بنے ہُوئے بمپر پوسٹ کا خیال آیا۔ کیوں نہ میں تین نمبر لیور دبا کر ڈبّوں کو بمپر پوسٹ سے ٹکرا دوں؟

" یہ بمپر پوسٹ کیا ہوتا ہے؟ " میں نے پوچھا۔

وہ بولا " آپ نے اِسٹیشنوں پر دیکھا ہو گا کہ ایک جگہ ریل کی پٹڑی ختم ہو جاتی ہے اور وہاں سیمنٹ کا بہت بڑا چبوترا بنا ہوتا ہے۔ یہاں خالی گاڑیاں کھڑی کی جاتی ہیں۔ اِسی جگہ کو بمپر پوسٹ کہتے ہیں۔ اچھا اب سُنیے۔ یہ فیصلہ کرنے کو تو میں نے کر لیا، لیکن اِس میں میری جان کا خطرہ تھا۔ کیونکہ اگر ڈبے بمپر پوسٹ سے ٹکرا جاتے تو اِس کے ساتھ میری کیبن کے بھی پرخچے اُڑ جاتے اور اِس صورت میں مجھے بھی اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑتے۔ پھر بھی میں نے سوچا کہ اِس طرح تو میں ہی اکیلا مروں گا، لیکن اگر مین لائن پر ڈبے آ گئے تو مسافر گاڑی پاش پاش ہو جائے گی اور سینکڑوں مُسافر موت کی بھینٹ چڑھ جائیں گے۔ نہیں نہیں، مجھے اپنی ہی قُربانی دینی چاہیے۔

" ڈبے اب ایک فرلانگ کے فاصلے پر تھے اور بہت زور و شور سے آ رہے تھے۔ میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے تین نمبر کا لیور دبا دیا اور جب سیمنٹ اور پتھر سے لدے ہوئے ڈبے بمپر پوسٹ لائن پر آ گئے تو میں جان بچانے کے لیے سیڑھیوں کی طرف بھاگا۔ ابھی ساتویں ہی سیڑھی پر قدم رکھا تھا کہ ایک کان پھاڑ دینے والا دھماکا ہُوا۔ ڈبے بمپر پوسٹ سے پوری قوت کے ساتھ ٹکرائے، ایک زلزلہ سا آ گیا اور میں نے ساتویں سیڑھی سے بے تحاشا نیچے چھلانگ لگا دی۔ نیچے گرتے ہی میں بے ہوش ہو گیا۔ جب ہوش آیا تو اپنی کیبن کو دیکھا جو پتھروں کا ڈھیر بنی ہوئی تھی اور اِس ڈھیر میں وہ ڈبے دھنسے ہوئے تھے۔ " یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔

رات چُوں کہ زیادہ جا چکی تھی اِس لیے اِسٹیشن ماسٹر اور سگنل والا شب بخیر کہہ کر چلے گئے اور ہم بستر پر لیٹے بہت دیر تک دل ہی دل میں اس بہادر اور نیک دل انسان کی تعریف کرتے رہے جس نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر سینکڑوں لوگوں کی جانیں بچائی تھیں۔

دِلچسپ و عجیب

یہ امریکا کے ایک شہر شِکاگو کا واقعہ ہے۔ ایک موٹر کار ریل کی پٹڑی پار کر کے دُوسری طرف جانا چاہتی تھی۔ جب وہ پٹڑی پر پہنچی تو ٹرین آ گئی۔ کار کا ڈرائیور تو جلدی سے دروازہ کھول کر باہر کُود گیا لیکن کار کے پرخچے اُڑ گئے۔ وہ بے چارہ اپنی کار کا ماتم کر رہا تھا کہ پولیس آ گئی اور اُس نے کار ڈرائیور کو پانچ ڈالر جُرمانہ کیا.. کیوں ــــ؟ اُس نے کار غلط جگہ پارک کی تھی!

لندن کے صرافہ بازار میں آئے دن ڈکیتی کی وارداتیں ہوتی رہتی ہیں۔ ایک دن ایک جوہری اپنی دُکان کھولنے آیا تو اچانک پاس کی گلی سے دو ڈاکو نکلے اور جوہری کے ہاتھ سے بریف کیس چھین کر بھاگ گئے۔

ڈاکوؤں کا خیال تھا کہ بریف کیس میں لاکھوں کے ہیرے جواہرات ہوں گے۔ لیکن اُنھوں نے بریف کیس کھولا تو اُس میں سے صرف بسکٹوں کا ایک ڈبا نکلا۔ ہا، بے چارے ڈاکو!

اب تو خیر دانت نکلوانا بہت آسان ہے۔ ڈاکٹر کونین کا ٹیکا لگا کر مسوڑے کو سُن کر دیتا ہے اور ایک مِنٹ میں زنبُور سے خراب دانت باہر کھینچ لیتا ہے۔ مریض کو درد کا اِحساس تک نہیں ہوتا۔

لیکن کچھ عرصہ پہلے یہ بات نہ تھی۔ اُس وقت کونین کا ٹیکا اِیجاد نہیں ہُوا تھا۔ ڈاکٹر زنبُور سے پکڑ کر دانت کھینچتا تو دانت کے ساتھ مریض کی جان بھی نکل جاتی اور وہ چیخیں مار مار کے آسمان سر پر اُٹھا لیتا۔

یہ اُسی زمانے کا قِصّہ ہے۔ اِٹلی کے دارُالحکومت روم کے ایک ڈاکٹر نے اخباروں میں اِشتہار دیا کہ وہ بغیر تکلیف کے دانت نکالتا ہے۔ اگر کوئی شخص مریض کی ایک چیخ بھی سُن لے تو وہ اُسے 100 روپے اِنعام دے گا۔

ڈاکٹر کا یہ دعویٰ دُرست تھا۔ جب کوئی مریض دانت نکلوانے آتا تو ڈاکٹر بینڈ باجے والوں کو بُلا لیتا، اور وہ اِتنے زور زور سے ڈھول بجاتے کہ اُن کے شور میں مریض کی چیخیں دب کر رہ جاتیں۔

قائدِ اعظم اور طالب علم

Sharjeel Ahmed !

قائدِ اعظم بچّوں اور نوجوانوں سے بڑی محبّت کرتے تھے۔ اُنہیں ہمیشہ فکر رہتی تھی کہ قوم کے یہ نونہال خوب محنت سے تعلیم حاصل کریں۔ اُن کا وقت فضول باتوں میں ضائع نہ ہو۔ اُن کی تربیت اچھی طرح ہو۔ وہ بڑے ہو کر ملک کی خوش حالی کا باعث بنیں۔ جب بھی اُنہیں موقع ملتا، طالبِ علموں سے اچھی اچھی باتیں کرتے، اُنہیں مُفید مشورے دیتے اور اُن کے تعلیمی کاموں میں گہری دلچسپی لیتے۔

آج سے 80 برس پہلے قائدِ اعظم لندن میں تھے۔ وہاں بہت سے مُسلمان طالبِ علم تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ قائدِ اعظم نے طالب علموں کے ایک جلسے میں تقریر کی اور کہا "آپ یہاں الگ تھلگ نہ رہیں۔ ہر قسم کے لوگوں سے ملیں۔ اُن کی اچھی باتیں اپنائیں اور یہ بات سمجھنے کی کوشش کریں کہ اِن لوگوں نے کیسے ترقّی کی ہے۔ پھر آپ اپنی ذِمّے داریاں سنبھالنے کے قابل ہو جائیں گے۔"

بابائے قوم طالب علموں سے کہتے تھے کہ وہ خالی خولی نعروں میں اپنا وقت ضائع نہ کریں۔ پڑھائی میں سخت محنت کریں اور ہر بات کو اچھی طرح سمجھنے کی کوشش کریں۔ وہ کہا کرتے تھے کہ کل کے طالبِ علم آج کے راہ نُما ہیں۔

قائدِ اعظم طالب علموں کو توڑ پھوڑ والی حرکتوں سے منع فرماتے تھے کیوں کہ اِس طرح اُن کا وقت ضائع ہوتا ہے۔ طالب علموں کو پہلے اپنی تعلیم مکمّل کرنی چاہیئے تاکہ اِس کے بعد وہ صحیح رائے قائم کرنے کے قابل ہو سکیں، قوم کی بہتری کے لیے عقل مندی اور دانائی سے کام کر سکیں۔

قائدِ اعظم باتوں سے زیادہ عمل کو پسند کرتے تھے۔ آج سے 50 برس پہلے دہلی کے ایک جلسے میں اُنہوں نے طالب علموں سے کہا "کچھ لوگ طالب علموں سے کہتے ہیں کہ مسلمان ہندوستان کو آزاد کرانے کے لیے پیدا ہوا ہے۔ وہ انہیں نعرے لگانے کے لیے کہتے ہیں، جوش دلاتے ہیں کہ جلسے جلوس نکالیں۔ ایسے لوگ طلبا کو گُمراہ کر رہے ہیں۔ اِن کی باتیں خوب صورت ضرور لگتی ہیں لیکن کیا اُن پر عمل بھی ہو سکتا ہے؟ کیا مسلمانوں کے پاس اِتنی طاقت اور سامانِ جنگ ہے کہ وہ انگریزوں کی حکومت سے ٹکّر لے سکیں۔ میں طالب علموں کا قتلِ عام نہیں چاہتا اور اُن سے کہتا ہوں کہ وہ جوش میں آکر اپنی قیمتیں جانیں ضائع نہ کریں۔ اُن کا کام دل لگا کر پڑھنا ہے، اُنہیں سخت محنت کی ضرورت ہے تاکہ وہ موجودہ زمانے کے مشکل حالات کو سمجھ سکیں۔ ایسی باتوں کا کوئی فائدہ نہیں کہ مسلمانوں نے سینکڑوں برس تک اِس ملک پر حکومت کی ہے اور اُنہیں اب بھی ہندوستان پر حکومت کرنے کا حق حاصل ہے۔ اِس وقت ہمیں صنعت و حِرفت میں ترقّی کرنے اور سخت محنت سے اپنا فرض ادا کرنے کی ضرورت ہے۔ صرف اِنہی خوبیوں سے ہم نئی قوم کی بُنیاد رکھ سکتے ہیں۔"

اِنہی دِنوں بابائے قوم نے ناگپور کے مسلمان طالب علموں سے کہا "آپ کو سیاست میں حصّہ لینے کی ضرورت نہیں جس میں ہر دن، ہر ماہ اور ہر سال تبدیلیاں آتی رہتی ہیں۔ اپنی قوم اور اپنے والدین کے لیے آپ کا سب سے بڑا فرض یہی ہے کہ اپنا ایک ایک لمحہ ایمان داری سے پڑھائی پر خرچ کریں۔ یاد رکھیے، آپ جتنا وقت ضائع کریں گے، وہ پھر کبھی آپ کو واپس نہیں ملے گا۔ آپ اِس نقصان کو کبھی پورا نہ کر سکیں گے۔ ہاں، آپ مُلکی حالات کے مُتعلّق زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ آپ کا تعلیمی فرض ہے۔"

حامد کے ابّا جان نے ثریّا اور حامد کے لیے پچھلی عید پر نئے جُوتے خریدے تھے۔ ثُریّا کا سینڈل ابھی تک ٹھیک تھا، لیکن حامد کا جُوتا خراب ہو گیا تھا۔ اُس کا تلا گھِس گیا تھا اور اوپر بھی دو جگہ سے ٹانکے کُھل گئے تھے۔ حامد نے ابّا جان سے کہا کہ وہ اُس کے لیے نیا جُوتا لا دیں۔ ابّا جان نے جواب دیا کہ دو دِن ٹھہر جاؤ۔ بازار جا کر نیا جوتا لے آئیں گے۔

حامد بولا "پھر ہم دو دن تک کیا کریں گے؟"

ابّا جان نے کہا "یہ جو نیچے موچی بیٹھا ہے، اُس سے جوتے کی مَرمّت کرا لو۔"

ابّا جان اور حامد کی باتیں سُن کر ننھی ثُریّا کے دماغ میں ایک سوال پیدا ہُوا۔ حامد بھائی کہہ رہے تھے کہ جوتے کے بغیر ہم دو دِن تک کیا کریں گے مگر جب جُوتا نہیں بنا تھا، تب انسان کیا کرتا ہو گا۔ اُس نے ابّا جان سے پوچھا "ابّا جان، جب جوتا نہیں بنا تھا تو لوگ کیا پہنتے تھے؟"

"ننگے پیر ہی پھرتے تھے" ابّا جان نے کہا "لیکن یہ اُس زمانے کی بات ہے جب اِنسان غاروں میں رہتا تھا، اور کپڑے کی جگہ پتّے لپیٹ کر اپنا بدن ڈھانپتا تھا۔ جنگل میں کھانے پینے کی چیزیں تلاش کرتے وقت جنگلی درختوں کے کانٹے یا نوک دار پتھر پاؤں میں چُبھتے تو اِنسان کو بہُت تکلیف ہوتی تھی۔ اِس تکلیف سے بچنے کے لیے اُس زمانے کے لوگ پتّے اور گھاس پھُوس اپنے پیروں کے نیچے باندھ لیتے تھے۔ پھر کچھ عرصے بعد انسان جانوروں کا شکار کر کے اُن کا گوشت کھانے لگا تو اُس نے اُن جانوروں کی کھال کے کپڑے بنانے شروع کر دیے۔ پھر وہ اِسی کھال کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو گھاس پھُوس کی جگہ پیروں پر لپیٹ لیتا تھا۔ کھال کے یہ جُوتے گھاس کے جوتوں سے زیادہ آرام دہ تھے۔ سردی میں اِن سے پیر بھی گرم رہتے تھے۔ پھر جب انسان نے ہڈّیوں کی باریک سُوئی بنالی اور کھال کے کپڑے سینے لگا تو اُس نے پاؤں پر کھال لپیٹنے کی

بجائے کھال کے چھوٹے چھوٹے خول سی کر پاؤں میں پہننا شروع کر دیے۔ یہ دُنیا کے سب سے پہلے جُوتے تھے۔

"اِن جوتوں میں یہ خرابی تھی کہ اِنہیں گرمی میں نہیں پہنا جا سکتا تھا۔ اِس مشکل کا حل یہ نکالا گیا کہ چمڑے کے ٹکڑے کو پیر کے تلوے کے برابر کاٹ لیا اور اُسے چمڑے کی پتلی پتلی پٹیوں سے پیر کے نیچے باندھ لیا۔ یہ جوتے بالکل چپّل کی طرح ہوتے تھے۔ ہزاروں سال پہلے مصر اور روم کے لوگ ایسے ہی جُوتے پہنا کرتے تھے۔

"روم کے لوگوں کو خوب صورت چیزیں بنانے کا بہت شوق تھا، اِس لیے وہ جوتوں پر رنگین تصویریں اور بیل بُوٹے بھی بنایا کرتے تھے۔

"مِصر میں سردی زیادہ نہیں ہوتی اور عام طور پر موسم گرم ہی رہتا ہے اِس لیے مصر کے لوگ ہلکے جوتے پہنتے تھے۔ جِن ملکوں میں زیادہ سردی ہوتی ہے، وہاں کے لوگوں نے بھاری جوتے بنائے جن سے پُورا پیر ڈھک جاتا تھا اور سردی سے محفوظ رہتا تھا۔ رفتہ رفتہ جوتوں کی شکل بدلتی رہی۔ کسی زمانے میں چھوٹے جوتے بہت پہنے جاتے اور کبھی لوگ بڑے جوتے پسند کرنے لگتے تھے۔

"ہزاروں سال پہلے، چین میں چھوٹے چھوٹے پاؤں خوب صورت سمجھے جاتے تھے۔ یہ لوگ بڑے پاؤں والے آدمی کو منحوس سمجھتے تھے۔ اِس لیے اُنھوں نے بچّوں کے لیے لوہے کے جوتے بنانے شروع کر دیے۔ ماں باپ چھوٹی عمر میں بچّوں کو لوہے کے جُوتے پہنا دیتے تھے، جِن سے اُن کے پاؤں بڑھنا بند ہو جاتے تھے۔ بعد میں اُن لوگوں نے دیکھا کہ چھوٹے پاؤں والے آدمیوں کو چلنے میں دُشواری ہوتی ہے اور وہ تیز نہیں دوڑ سکتے۔ تب اُنھوں نے لوہے کے جوتے بنانا بند کر دیے۔

"ہندوستان میں ایک زمانے میں لکڑی کے جوتوں کا بھی رواج تھا۔ اِن جوتوں کو کھڑاؤں کہتے تھے۔ اب بھی بہت سے لوگ لکڑی کے کھڑاؤں پہنتے ہیں۔

"آج کل ربڑ اور پلاسٹک کے جوتے بھی بنائے جاتے ہیں لیکن دنیا بھر میں سب سے زیادہ چمڑے کے جوتے اِستعمال ہوتے ہیں۔

"ابّا جان، یہ چمڑا کہاں سے آتا ہے؟" حامد نے پوچھا۔

"ہاں، اب ہم تمھیں بتاتے ہیں کہ چمڑا کس طرح بنتا ہے اور اِس سے جوتے کس طرح بنائے جاتے ہیں" ابّا جان نے کہا۔

"چمڑا جانوروں کی کھال سے بنتا ہے۔ ہر روز ہزاروں بکریاں، بھیڑیں اور گائے بھینسیں ذبح کی جاتی ہیں۔ اُن کی کھال اُتار کر اُسے سُکھا لیا جاتا ہے۔ کھال کو دھوپ میں سُکھانے سے پہلے اُس پر نمک یا شورا لگا دیتے ہیں جِس سے کھال کی بدبُو دُور ہو جاتی ہے۔ جب کھال خوب سُوکھ جاتی ہے تو اُسے رگڑ کر صاف کر لیتے ہیں۔ اِس صاف کھال کو کچّا چمڑا کہتے ہیں۔ یہ کچّا چمڑا زیادہ مضبوط نہیں ہوتا۔ اِس کو بڑی محنت سے مضبوط بنایا جاتا ہے۔ درختوں کی چھال کو پانی میں بھگو کر ایک طرح کا مسالا تیّار کیا جاتا ہے۔ پھر اِس مسالے کو چمڑے پر ڈال کر اُسے خوب رگڑتے ہیں۔ یہ مسالا جب چمڑے کے اندر پہنچ جاتا ہے تو پھر چمڑے کو دھوپ میں سُکھاتے ہیں۔ پھر اُس کو کُوٹ کُوٹ کر ہموار کرتے ہیں۔ اِس طرح کئی بار مسالا لگانے اور کوٹنے سے چمڑا مضبوط ہو جاتا ہے۔

"جوتے بنانے کے لیے کئی طرح کے چمڑے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جوتے کا اُوپر کا حِصّہ نرم اور خوبصورت ہوتا ہے۔ یہ چمڑا بھیڑ، بکری اور دوسرے چھوٹے جانوروں کی کھال سے بنایا جاتا ہے۔ تلے کا چمڑا موٹا ہوتا ہے۔ یہ چمڑا بھینس، گائے، بیل وغیرہ کی کھال کا ہوتا ہے۔

"جوتا بنانے والے کاری گر بازار سے اپنی پسند کا چمڑا خرید کر اُس سے جُوتے تیّار کرتے ہیں۔ آج کل جوتے بنانے کے لیے بڑے بڑے کارخانے قائم ہو گئے ہیں جہاں مشینوں سے جوتے بنائے جاتے ہیں۔ لیکن اب بھی ہمارے ملک میں زیادہ تر جوتے ہاتھ ہی سے بنائے جاتے ہیں۔

"جوتا بنانے والے کاریگر کے پاس لکڑی کے چھوٹے بڑے سانچے ہوتے ہیں، جو دیکھنے میں بالکل آدمی کے پیر کی طرح ہوتے ہیں۔ کوئی ایک سال کے بچے کے پیر کے برابر، کوئی پانچ سال کے بچّوں کے پیر جتنا۔ اِس طرح بڑے چھوٹے پیروں کے بُہت سے سانچے بنائے جاتے ہیں۔

"جب ہم جُوتا پہن کر چلتے ہیں تو ہمارا پیر بار بار اُوپر نیچے مُڑتا ہے۔ اگر تمام جوتا سخت چمڑے کا بنا ہُوا ہو تو اِس سے پیر کو تکلیف پہنچے گی۔ اِسی لیے جوتے کا اُوپر کا حصّہ نرم چمڑے کا بنایا جاتا ہے۔ اِس چمڑے کو پیر کی حرکت کے مُطابق کئی جگہ سے کاٹ کر جوڑ ڈالے جاتے ہیں۔ خوب صورتی کے لیے چمڑے کے کئی ٹکڑوں کو طرح طرح کے ڈیزائن بنا کر سی دیا جاتا ہے، جسے جوتے کے کاریگر 'اُپر' کہتے ہیں۔ یہ اُپر نرم اور رنگ دار چمڑے کا بنایا جاتا ہے۔ اِس اُپر کو لکڑی کے بنے ہوئے پیر کے نمونے والے سانچے پر چڑھا کر رکھ دیتے ہیں۔

"جوتے کا تلا مضبوط، موٹے اور سادہ چمڑے کا بنایا جاتا ہے۔ موٹے چمڑے کو پیر کے تلوے کی طرح نشان لگا کر کاٹ لیا جاتا ہے۔ اِسے تلا یا سول کہتے ہیں۔ سول کو لکڑی کے سانچے پر لگا کر چھوٹی چھوٹی کیلوں سے اُپر کے ساتھ ٹھونک دیتے ہیں۔ بُہت سے جوتوں میں کیلیں نہیں لگائی جاتیں۔ ایسے جوتوں کے اُپر کو گوند یا سریش لگا کر تلے کے ساتھ چِپکا دیتے ہیں۔ جب اُپر اور سول اچھی طرح چِپک جائیں تو لکڑی کے سانچے کو باہر نکال لیتے ہیں اور لوہے کے موٹے سُوئے سے اُپر اور سول کو مضبوط تاگے سے سی دیا جاتا ہے۔

سِلائی کے بعد اِن جوتوں کو پھر لکڑی کے سانچے پر چڑھا دیا جاتا ہے۔ اب اِن میں ایڑی لگائی جاتی ہے۔ مردانہ جُوتوں میں چمڑے کے ٹکڑوں کو اُوپر تلے جوڑ کر جوتے کے پچھلے حصّے میں کیلوں سے ٹھونک دیا جاتا ہے۔ عورتوں کے جُوتوں میں لکڑی کی اُونچی ایڑی بھی لگائی جاتی ہے۔ لکڑی کی ایڑی لگانی ہو تو لکڑی کے چاروں طرف باریک چمڑے کی تہ چِپکا دی جاتی ہے۔

"اب جُوتا بن کر تیار ہو گیا لیکن ابھی یہ بھدّا ہے۔ جگہ جگہ کیلیں لگی ہوئی ہیں۔ سِلائی کے دھاگے بھی نظر آ رہے ہیں۔ اب جُوتے کو لکڑی کے سانچے سے اُتار کر اُس کے اندر کی طرف پتلے چمڑے کا ایک خوب صورت ٹکڑا چِپکا دیتے ہیں۔ اِسے پیتاوا کہا جاتا ہے۔ جُوتے کے تلے اور ایڑی کے کناروں کو شیشے کے ٹکڑے یا کسی دوسری دھار والی چیز سے گھِس کر صاف اور چِکنا کرتے ہیں۔ پھر اِن کناروں پر اچھا سا رنگ لگا کر پالش کر دی جاتی ہے۔ عورتوں کے جُوتوں کے اُپر کو خوب صورت بنانے کے لیے اُس پر پھول پتّیاں بناتے ہیں۔

آج کل چمڑے کے عِلاوہ ربڑ، پلاسٹک اور دوسری چیزوں کے جوتے بھی بنائے جاتے ہیں۔ چمڑے کے جوتوں میں بھی ربڑ کے تلے لگائے جاتے ہیں۔ ربڑ کے تلے چمڑے سے زیادہ مضبوط اور سستے ہوتے ہیں۔

حامِد نے جب یہ سُنا کہ ربڑ کے تلے چمڑے سے مضبوط ہوتے ہیں تو فوراً بولا "آپ ہمارے لیے ربڑ کے تلے والا جُوتا خریدیے گا۔"

"ہاں ہاں، ربڑ والا ہی خرید دیں گے مگر پہلے آپ پُوری بات تو سُن لیجیے" ابّا جان نے کہا "پاکستان کے بنے ہوئے جوتے دوسرے مُلکوں میں بھی بھیجے جاتے ہیں۔ تم نے ہندوستان کے شہر آگرہ کا نام تو سُنا ہو گا۔ یہ شہر جوتے بنانے کا بُہت بڑا مرکز تھا۔ آگرے کے ہزاروں مسلمان کاری گر پاکستان بننے کے بعد ہندوستان سے پاکستان آ گئے اور یہاں آ کر اُنھوں نے جوتے بنانے کے سینکڑوں چھوٹے چھوٹے کارخانے قائم کیے۔ پاکستان کے بنے ہوئے جوتوں میں پشاور کے زری کے چپّل اور سُنہری کام کے سلیم شاہی جوتے بُہت مشہور ہیں۔ یہ جُوتے دنیا کے بُہت سے مُلکوں میں پسند کیے جاتے ہیں۔ بتاؤ، پسند آئی جُوتے کی کہانی؟"

"بُہت خوب! بُہت خوب!" حامِد نے کہا "لائیے روپیہ دیجیے۔ جُوتا مَرمّت کرا لاؤں۔"

آئیے مسکرائیں

تین گپّی بیٹھے گپیں ہانک رہے تھے۔ ایک گپّی بولا "ایک دن میں جنگل میں گیا تو اچانک میرے سامنے تین شیر آ گئے۔ میری بندوق میں صرف ایک ہی گولی تھی۔ میں نے اُن سے کہا: لائن میں کھڑے ہو جاؤ۔ وہ لائن میں کھڑے ہو گئے تو میں نے ایک ہی گولی سے تینوں کو مار دیا۔"

دُوسرا گپّی بولا "ایک دن میں جنگل میں گیا تو میرے پاس صرف بندوق کا لائسنس تھا۔ بندوق نہیں تھی۔ میں نے شیر کو لائسنس دکھایا تو وہ ڈر کے مارے مر گیا۔"

تیسرا گپّی کہنے لگا "تم دونوں نے کوئی خاص بات نہیں کی۔ ایک دن میں جنگل میں گیا تو میرے پاس نہ بندوق تھی نہ لائسنس۔ میں نے شیر سے کہا: تمہیں شرم نہیں آتی، بھرے جنگل میں ننگے پھر رہے ہو؟ یہ سُنتے ہی وہ شرم کے مارے مر گیا۔"

(محمّد سلمان فاروق، لاہور)۔

جج (مُلزِم سے): تم ہر بار ایک ہی گھر میں چوری کیوں کرتے ہو؟

مُلزِم: حضُور، میں اِس گھر کا فیملی چور ہوں۔

(صائمہ فاروق، شیرانوالہ لاہور)

بیٹا (باپ سے): ابّو جی، آپ لمبے ہوتے جا رہے ہیں۔

باپ: بیٹا جی، آپ کو کیسے پتا چلا؟

بیٹا: آپ کا سر بالوں میں سے نکلتا آ رہا ہے۔

(فائزہ شاکر، چشمہ بیراج)

دو آدمی ایک دوسرے کو باہر کے مُلکوں کے قصّے سُنا رہے تھے۔ ایک آدمی کہنے لگا "امریکا کے ہوٹلوں کی سروِس اِتنی تیز ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ پچھلے دنوں میں نیویارک کے ایک ہوٹل میں ٹھہرا۔ میں نے بیرے کو فون کیا کہ مجھے انڈا چاہیے۔ اُس نے کہا: پیچھے دیکھیے۔ میں نے پیچھے دیکھا تو ایک مُرغی آئی اور انڈا دے کر چلی گئی۔

دوسرا آدمی بولا "لندن کے ہوٹلوں کا بھی یہی حال ہے۔ میں نے بیرے کو فون کیا کہ مجھے چائے چاہیے۔ اُس نے کہا: رسیوَر کو مُنہ لگائیے۔ چائے آ رہی ہے۔"

(صدف نورین، اسلام آباد)۔

دو دوست دریا کے کنارے سیر کر رہے تھے کہ اچانک ایک فقیر نے صدا لگائی "اللہ کے نام پر کچھ دے جا، بابا۔"

ایک دوست نے فقیر کو ایک روپیہ دیا اور ساتھ ہی اُسے دریا میں دھکّا دے دیا۔ پہلے دوست نے حیران ہو کر اِس کی وجہ پوچھی تو اُس نے جواب دیا "نیکی کر، دریا میں ڈال۔"

(محمّد اشرف، منڈی بہاءُ الدّین)۔

ایک دفعہ مُلّا نصرُالدّین پھِرتے پھِراتے ایک گاؤں میں جا پہنچے۔ بھُوک سے بُرا حال تھا۔ اُنہوں نے گاؤں والوں سے کہا "جلدی سے میرے لیے کھانے کا بندوبست کر دو، ورنہ میں آپ کے ساتھ بھی وہی سلوک کروں گا جو دوسرے گاؤں والوں کے ساتھ کیا ہے۔"

گاؤں والے مُلّا کی یہ بات سُن کر خوف زدہ ہو گئے اور اُنہوں نے اچھّے اچھّے کھانے تیّار کر کے مُلّا کے سامنے رکھ دیے۔

جب مُلّا کھا چکے تو لوگوں نے پُوچھا "حضرت، آپ نے دوسرے گاؤں والوں کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا؟"

مُلّا نے جواب دیا "میں نے اُن سے کھانا مانگا تو اُنہوں نے اِنکار کر دیا۔ میں وہاں سے آپ کے ہاں چلا آیا۔ آپ لوگ بھی اِنکار کر دیتے تو کسی اور گاؤں چلا جاتا۔"

(ضیاءُ الحق، عارف والا)۔

سردی آئی

سُرور بجنوری

آیا ہے سردی کا زمانہ
ختم ہُوا گرمی کا فسانہ
اندر سونے کی رُت آئی
گرم بچھونے کی رُت آئی
اُونی کپڑے پہنے ہم نے
مار دیا سردی کے غم نے
دہکائے ہیں لال انگارے
کانپ رہے تھے ٹھنڈ کے مارے
چائے کا وہ دَور ہے جاری
پیتے ہیں سب باری باری
مُونگ پھلی لاتا ہے کوئی
چلغوزے کھاتا ہے کوئی
دُھوپ پہ دُنیا یُوں مرتی ہے
سُورج کا پیچھا کرتی ہے
اور بتاؤں کیا کیا باتیں
دِن چھوٹے ہیں، لمبی راتیں

خُدا کے لیے

مُدّت گزری، کسی شہر میں دو نیک اور خدا ترس بھائی رہتے تھے۔ ایک کا نام تھا شفیق اور دوسرے کا رفیق۔ کام کاج کے بعد اُنہیں جتنا وقت ملتا، وہ اُسے غریبوں کی مدد کرنے میں صَرف کرتے۔ کئی مُحتاج، بیوائیں اور یتیم بچّے اُن کے سہارے جی رہے تھے۔

ایک دن کی بات ہے، دونوں بھائی کام سے فارغ ہو کر گھر کی طرف چلے۔ رفیق آگے آگے چل رہا تھا اور شفیق پیچھے پیچھے۔ یکایک رفیق کو سڑک پر ایک چمکتی ہوئی چیز دکھائی دی۔ اُس نے اُسے جُھک کر غور سے دیکھا اور پھر اِس طرح خوف زدہ ہو کر بھاگا جیسے وہ کوئی سانپ ہو۔

شفیق کو بہُت حیرت ہوئی۔ اُس نے بھی جُھک کر اُس چیز کو دیکھا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ سڑک کے بیچوں بیچ ایک بڑا سا ہیرا پڑا جگ مگ کر رہا ہے۔

"ارے! ـــــ یہ تو ہیرا ہے! ـــــ بہُت قیمتی معلوم ہوتا ہے" وہ زور سے بولا "میرا بھائی اِسی کو دیکھ کر بھاگا ہے۔ لیکن وہ بھاگا کیوں؟ ـــــ دولت بُری شے نہیں۔ بُرا تو وہ آدمی ہے جو اُسے بُرے کاموں میں صَرف کرتا ہے۔ دولت سے جہاں اِنسان کو نُقصان پہنچ سکتا ہے، وہاں فائدہ بھی ہوتا ہے۔ کتنی ہی بیوائیں اور یتیم بچّے اِس دولت سے پل سکتے ہیں۔ کتنے ہی ننگوں کو کپڑا مل سکتا ہے اور کتنے ہی غریب اِس کی بدولت غریبی کے چُنگل سے آزاد ہو سکتے ہیں ـــــ ہمارا کام لوگوں کی خدمت کرنا ہے لیکن ہم اُن کی اِتنی ہی خدمت کر سکتے ہیں جتنی ہماری ہستی ہے۔ اِس ہیرے کو بیچ کر میں اُن کی زیادہ سے زیادہ مدد کر سکوں گا۔ لوگ مجھے دعائیں دیں گے، میرے نام کی مالا جپا کریں گے اور اِس طرح میں ساری دُنیا میں مشہور ہو جاؤں گا۔" یہ سوچ کر اُس نے ہیرا اُٹھا کر جیب میں رکھ لیا اور تیز تیز قدم اُٹھاتا ایک طرف کو چلنے لگا۔

شفیق نے سوچا کہ اگر میں اِس شہر میں رہوں گا تو لوگ شک کریں گے کہ اِس کے پاس ایک دم اِتنی دولت کہاں سے آ گئی اِس لیے وہ ایک دوسرے شہر میں چلا گیا اور ایک جوہری

کے ہاتھ ہیرا بیچ دیا۔ اُس نے سوچا تھا کہ کچھ دن بعد رفیق کو بھی اپنے پاس بُلالوں گا۔

وہ ہیرا بہت قیمتی تھا اور کئی لاکھ روپے میں فروخت ہُوا۔ اِن روپوؤں سے اُس نے تین بڑی بڑی عمارتیں بنوائیں۔ ایک بیواؤں اور یتیموں کے لیئے یتیم خانہ تھا، دوسرا غریبوں کے لیے خیراتی ہسپتال اور تیسری سرائے جس میں غریب مُسافروں کی رہائش کا اِنتظام تھا۔ اِن کی دیکھ بھال کے لیے اُس نے اِیمان دار آدمی مُلازِم رکھے۔ یہ سب کام کرنے کے بعد بھی اُس کے پاس کافی روپیہ بچ گیا۔

تھوڑے ہی عرصے میں یتیم خانہ یتیموں سے، ہسپتال بیماروں سے اور سرائے مُسافروں سے بھر گئی۔ لوگ صبح شام شفیق کو دعائیں دیتے اور جہاں کہیں دو چار آدمی مِل بیٹھتے اُس کی فیاضی اور خدا ترسی کا چرچا کرتے۔ غرض اُس کی نیکی اور خدا ترسی کی شُہرت مُلک کے کونے کونے میں پھیل گئی۔

تھوڑے عرصے بعد اُسے اپنا بھائی یاد آیا۔ اُس نے سوچا "معلوم نہیں وہ کس حالت میں ہے۔ زندہ بھی ہے یا مر گیا۔ میں نے اُس کا نام کبھی کسی سے نہیں سُنا۔ حال آں کہ میرا نام ہر ایک کی زبان پر ہے۔ اُس نے غلطی کی کہ ہیرے کو دیکھ کر بھاگ گیا۔ میں نے اچھا کیا کہ اُسے اُٹھالیا اور اُسے بیچ کر یتیم خانہ، ہسپتال اور سرائے بنوائی۔ اب میرا نام بچّے بچّے کی زبان پر ہے اور ہزاروں لوگ مجھے دعائیں دیتے ہیں۔"

اُس نے اپنے وُہی پُرانے کپڑے پہنے جنہیں پہن کر وہ اِس شہر میں آیا تھا اور بھائی سے ملنے کے لیے چل پڑا۔

ابھی وہ شہر میں داخل ہی ہُوا تھا کہ اُسے ایک بُوڑھا ملا جس کے چہرے پر فرشتوں کا سا نُور برس رہا تھا۔ بوڑھے نے اُسے روک لیا اور بولا "اے شخص! تُو جہاں سے آیا ہے، وہیں واپس چلا جا۔ تو اپنے بھائی کے ساتھ رہنے کے قابِل نہیں۔ وہ تجھے اُس وقت تک نہیں ملے گا جب تک تو سیدھے راستے پر نہیں آ جائے گا۔"

"کیا کہا؟ ــــ میں غلط راستے پر ہُوں؟" شفیق نے کانپتے ہوئے کہا "میں نے سینکڑوں مریضوں کو نئی زندگی بخشی ہے، میں نے غریب مُسافروں کے لیے سرائے اور بے آسرا یتیموں کے لیے یتیم خانہ بنوایا ہے۔ ہزاروں لوگ میرے ٹکڑوں پر پَل رہے ہیں اور اُن کی زبان مجھے دُعائیں دیتے ہُوئے سُوکھی جا رہی ہے۔"

بُوڑھا بولا "لیکن ذرا سوچ تو سہی۔ یہ سب کام تُو کِس لیے کر رہا ہے؟ خدا کی خوش نُودی حاصل کرنے کے لیے؟ نہیں۔ تُو نے ہسپتال، سرائے اور یتیم خانہ اِس لیے بنوایا ہے کہ لوگ تیری تعریف کریں۔ تمام دُنیا میں تیری واہ واہو۔ جو شخص اپنے نام کی خاطر کوئی بھلائی کرتا ہے، خُدا اُس سے خوش نہیں ہوتا۔ اُس کی تمام نیکیاں اکارت جاتی ہیں۔ نیکی وہ ہے جو چُپ چاپ کی جائے، اِس طرح کہ دایاں ہاتھ دے تو بائیں ہاتھ کو خبر نہ ہو۔ اِسی سے خدا خوش ہوتا ہے۔"

یہ کہہ کر بُوڑھا چلا گیا اور شفیق روتا دھوتا اپنے بھائی کے گھر پہنچا۔ رفیق گھر پر تھا۔ اُس نے دستک سُن کر دروازہ کھولا تو شفیق نے "میرا بھائی" کہہ کر اُسے گلے لگانا چاہا مگر رفیق ایک طرف ہٹ گیا اور بولا "بھیّا، یہ بھی دِکھاوے کے لیے تو نہیں کر رہے ہو؟"

شفیق نے یہ سُن کر شرم سے سر جُھکا لیا۔ رفیق نے کہا "میں خواب میں اکثر دیکھتا تھا کہ تم اپنا نام کرنے کے لیے نیک کام کر رہے ہو اور لوگ تمہاری سخاوت کے گیت گا رہے ہیں۔ لیکن اب مجھے اُمّید ہے کہ تُم سیدھے راستے پر آ گئے ہو۔ اب تمہیں معلوم ہو گیا ہے کہ نیک کام نام کے لیے نہیں، خدا کی خوش نُودی کے لیے کرنے چاہئیں۔ کل رات میں نے خواب میں تمہیں گھر آتے دیکھا تھا۔ مگر میں تم سے اِس حالت میں ملنا نہ چاہتا تھا۔ تم گُم راہ تھے۔ میں نے ایک بُوڑھے کا رُوپ دھار لیا ــــ پیارے بھیّا، وہ بُوڑھا جو راستے میں تمہیں مِلا تھا، تمہارا بھائی رفیق ہی تھا ــــ"

شفیق یہ سُن کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اب وہ سمجھ گیا تھا کہ جو بھی اچھا اور نیک کام کیا جائے، وہ صرف خدا کے لیے

کرنا چاہیے نہ کہ شُہرت حاصل کرنے کے لیے۔

وہ شرم سے سر جُھکائے کھڑا تھا کہ رفیق بولا "اِس کے عِلاوہ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ روپیہ جس سے تم نے لوگوں کی بھلائی کے کام کیے تمہارا اپنا نہیں تھا۔ تمہارا فرض تھا کہ وہ ہیرا اُٹھا کر اُس کے اصل مالک کو پہنچا دیتے، لیکن تم نے ایسا نہیں کیا۔ یہ سچ ہے کہ تم نے اُسے بیچ کر ہسپتال، سرائے اور یتیم خانہ بنوایا لیکن بھلا سوچو تو، دوسرے کی دولت خرچ کرنے کا تمہیں کیا حق تھا؟ تم خدا اور قانون کی نظروں میں مُجرِم ہو اور تمہیں دُنیا اور آخرت میں اِس کی سزا ملے گی۔"

"میں بہُت شرمندہ ہُوں، بھائی" شفیق نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا "میں سمجھتا تھا کہ زیادہ دولت ملنے پر میں لوگوں کی زیادہ سے زیادہ خِدمت کر سکوں گا۔"

"لوگوں کی خِدمت صرف روپے پیسے ہی سے نہیں کی جاتی" رفیق نے کہا "اچھّے سلوک سے بھی کی جا سکتی ہے۔ اگر کسی کے پاس روپیہ پیسہ نہ بھی ہو تو وہ کسی اندھے کو راستہ دِکھا کر، کسی بیوہ کو تسلی دے کر، کسی یتیم بچّے کے سر پر مُحبت سے ہاتھ پھیر کر یا کسی بیمار کو دِلاسا دے کر خدا کی خوشنُودی حاصِل کر سکتا ہے۔"

"آؤ بھائی، میرے ساتھ چلو ___" شفیق بولا "اُس شخص کو تلاش کریں جس کا وہ ہیرا تھا۔ وہ جو سزا بھی دے گا مجھے منظور ہو گی۔" (ٹالسٹائی کی کہانی سے ماخوذ)

نُورِ ہدایت

Excellent

ہمارے پیارے نبی حضرت محمّد صلّی اللہ علَیہِ وسلّم کے دوسرے خلیفہ حضرت عُمر رضی اللہ عنہُ نے ایک مرتبہ اپنے تمام گورنروں کو بُلایا اور اُن سے کہا:

"یاد رکھو! میں نے تمہیں حاکم بنا کر نہیں بھیجا۔ میں نے تمہیں اِمام بنا کر بھیجا ہے تاکہ لوگ تمہارے پیچھے چلیں۔ تم مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کرو۔ اُن کے اُوپر سختیاں نہ کرو کہ وہ ذلیل ہوں۔ اُن کی فریاد سُننے کے لیے اپنے دروازے بند نہ کرو۔ خود کو عام مسلمانوں سے بہتر خیال نہ کرو کیوں کہ یہ بھی ظلم کی ایک شکل ہے"۔

حضرت عُمرؓ جب کسی شخص کو کسی صوبے کا گورنر مُقرّر کرتے تو اُس سے یہ عہد لیتے تھے:

"میں تُرکی گھوڑے پر سوار نہ ہُوں گا۔ (اُس زمانے میں تُرکی گھوڑا بہُت قیمتی ہوتا تھا)، باریک کپڑے نہیں پہنوں گا۔ چھنا ہوا آٹا نہیں کھاؤں گا۔ دروازے پر پہرے دار نہ رکھوں گا"۔

حضرت عُمرؓ کے حکم سے اِسلامی حکومت کے تمام گورنر ہر سال، حج کے موقع پر، مدینے میں جمع ہوتے تھے۔ جب سب گورنر اِکھٹّے ہو جاتے تو حضرت عُمرؓ حاجیوں سے کہتے کہ آپ کو کسی گورنر سے کوئی شکایت ہو تو بیان کریں۔ اگر کوئی مسلمان شکایت کرتا تو اُس کی تحقیق کی جاتی اور اُسے دُور کیا جاتا۔

ایک دِلچسپ چکما

Excellent

کاغذ پر یہ حروف لکھیے:

رص ف   ی ک ا   ظ ل ف

اور اپنے دوست سے کہئے کہ اِن حرفوں سے صِرف ایک لفظ بنائے۔

وہ بے چارہ بہُت دماغ لڑائے گا، مگر کامیاب نہ ہو گا۔ کیوں کہ اِن 9 حرفوں سے ایک لفظ بن سکتا ہی نہیں۔ جب وہ ہار مان لے تو پہلے مٹھائی کا وعدہ لیجیے، اور پھر بتا دیجیے۔

شروع کے تین حروف (رص ف) کو ترتیب سے لکھیے۔ یہ بنا "صرف" ۔ اِس کے بعد بیچ کے تین حروف (ی ک ا) کو ترتیب سے لکھیے۔ یہ بنا "ایک" ۔ اب آخری تین حروف (ظ ل ف) ترتیب سے لکھیے۔ یہ بنا "لفظ"۔ لیجیے صِرف ایک لفظ بن گیا۔

دیکھیے، کتنا مزے دار ٹرِک ہے۔ چھوٹے میاں تو چھوٹے میاں، بڑے میاں بھی چکرا جائیں گے۔

نفرت

اشفاق احمد خاں

نیاز صاحِب گلی میں داخل ہوئے تو گلی میں کھیلتے ہوئے بچّوں نے اپنا کھیل بند کر دیا۔ راشِد، ٹمّی، عِمران سبھی کھیل بھول چکے تھے۔ اُن کی آنکھوں میں کسی قدر خوف جھلک رہا تھا۔ نیاز صاحِب نے اُن پر حقارت بھری نظر ڈالی اور اپنے مکان کی سیڑھیاں چڑھ گئے۔ اُن کے اُوپر جاتے ہی گلی میں پھر وہی رونق بحال ہو گئی اور بچّے پھر شور مچانے لگے۔

نیاز صاحِب ایک سرکاری دفتر میں مُلازِم تھے۔ عِمران کے گھر کا اُوپر والا حصّہ انہوں نے کرائے پر لے رکھا تھا۔ چُوں کہ وہ تنہا اور اکیلے تھے اِس لیے دفتر کے بعد کا سارا وقت گھر پر ہی گزارتے تھے۔ محلّے کے لوگوں سے اُن کے تعلّقات اچھّے تھے۔ لیکن عجیب بات تھی کہ بچّوں کے مُعاملے میں اُن کی ساری نرمی، تمام خوش اَخلاقی ختم ہو کر رہ جاتی تھی۔ وہ بچّوں کو اِنتہائی ناپسند کرتے تھے۔ بلکہ یہ کہ لیں کہ وہ اُن سے نفرت کرتے تھے۔ اِسی وجہ سے جب وہ گلی میں نکلتے تو بچّوں کو دیکھ کر اُن کی کیفیّت عجیب سی ہو جاتی۔ وہ بچّوں کو ڈانٹنے اور بُرا بھلا کہنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔

اب ظاہر بات ہے کہ بچّے بھی اُنہیں ناپسند کرتے تھے۔ جب اُن کا دفتر سے واپسی کا وقت ہوتا تو بچّوں کی کوشش ہوتی کہ گلی میں نہ کھیلیں، کچھ تو ڈر کی وجہ سے اور کچھ اپنے والدین کی تنبیہ کی وجہ سے کیوں کہ نیاز صاحِب نے اُن کے والدین سے اُن کی شکایت کی تھی۔ حالانکہ بچّے خود ہی اِس بات کا خیال رکھتے تھے کہ وہ جس وقت گھر پر موجود ہوں، گلی میں زیادہ شور نہ ہو۔ لیکن یہ کہاں ممکن ہے کہ بچّے کھیلیں اور شور نہ ہو۔ اُن کا شور نہ ہو تو زندگی کا اِحساس ہی نہیں ہوتا۔ اور بچّے شور نہ کریں تو خود بور ہونے لگتے ہیں۔

ایک دن کیا ہُوا، عِمران، راشِد اور ٹمّی اپنے ساتھیوں کے ساتھ چاند تارا کھیل رہے تھے۔ گیند کبھی اِدھر پھینکی جا رہی تھی، کبھی اُدھر ایک ہنگامہ سا برپا تھا۔ بچّے گیند سے بچنے کے لیے دوڑتے پھر رہے تھے۔ اُن کی بدقسمتی دیکھیے کہ گیند دیوار سے ٹکرا کر زور سے اُچھلی تو غڑاپ سے نیاز صاحِب کے صحن میں چلی گئی۔ لڑکوں کا تو خوف سے خون خشک ہو گیا۔ وہ مُنتظِر تھے کہ ابھی نیاز صاحِب باہر نکل کر اُن پر برسیں گے اور بُری طرح ڈانٹیں گے۔ لیکن یا حیرت! کتنے ہی مِنٹ خاموشی سے گزر گئے اور کچھ بھی نہ ہُوا۔ لڑکے آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے۔ عِمران بولا:

"نیاز صاحِب گھر میں ہیں بھی یا نہیں؟"

"بیوقوف!" ارشد نے اُس کا رُخ نیاز صاحب کے دروازے کی طرف کر کے کہا "دیکھو، دروازہ اندر سے بند ہے۔ اِس کا مطلب ہے کہ وہ اندر موجود ہیں۔"

"تو ابھی تک آئے کیوں نہیں؟"

"شاید سو رہے ہوں گے" ایک لڑکے نے کہا۔

"نہیں ــــ نہا رہے ہوں گے" دوسرے نے اندازہ لگایا۔

"ایسا کرتے ہیں، دروازہ کھٹ کھٹا کر اُن سے گیند مانگ لیتے ہیں" ٹمّی نے رائے پیش کی۔

"تاکہ اُنہیں نہیں بھی پتا ہو تو پتا چل جائے" عمران نے کہا "اور پھر اُن کی ڈانٹ کا کورس شروع ہو جائے۔"

"لیکن گیند تو واپس لینی ہے" راشد نے سنجیدگی سے کہا "ابھی صُبح ہی تو خریدی ہے۔"

"بھڑوں کے چھتّے میں ہاتھ ڈالنے کی بات ہو گی یہ تو" ایک لڑکے نے رائے دی۔

"کچھ بھی ہو۔ گیند ضرور لینا ہے" ٹمّی نے کہا "آؤ تو سہی ــــ کوشش کرتے ہیں۔"

یہ کہہ کر اُس نے نیاز صاحب کو بُلانے کے لیے گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔ لیکن دو تین مِنٹ اِنتظار کے بعد بھی نیاز صاحب باہر نہ نکلے۔ اِس پر ٹمّی نے دو تین مرتبہ پھر گھنٹی بجائی۔ اب کی بار دروازہ کھُل گیا۔ نیاز صاحب نے باہر جھانکا اور بچّوں کو دیکھ کر یُوں مُنہ بنایا جیسے حلق میں کڑواہٹ گھُل گئی ہو۔ وہیں سے بولے "کیا بات ہے؟"

سبھی لڑکے خاموش کھڑے تھے۔ عمران نے حوصلہ کر کے کہا "نیاز صاحب، ہماری گیند آپ کے ہاں چلی گئی ہے ــــ وہ دے دیں۔" نیاز صاحب کا چہرہ تو اِتنا سُنتے ہی لال بھبھو کا ہو گیا۔ وہ چلّائے "دفعہ ہو جاؤ! یہاں کوئی گیند نہیں ہے۔" یہ کہہ کر دھڑ سے دروازہ بند کر لیا۔ تمام بچّے اپنا سا مُنہ لے کر رہ گئے۔ سبھی کے دِل میں نیاز صاحب کے خلاف بہت غصّہ اور نفرت تھی لیکن وہ کچھ کر نہیں سکتے تھے۔

دو دِن بعد عمران نے محسوس کیا کہ نیاز صاحب اِن دو دِنوں کے دوران میں ایک مرتبہ بھی گھر سے باہر نہیں نکلے نہ دفتر گئے نہ بازار۔ یہ ایک عجیب اور انوکھی سی بات تھی عمران نے راشد سے تذکرہ کیا "بھئی راشد، نیاز صاحب دو دن سے نظر نہیں آئے۔"

"خدا کا شکر ہے" راشد نے چہک کر کہا "لیکن تمہیں اِتنی فِکر کیوں ہے؟"

"آخر ہمارے محلّے دار اور ہمسائے بھی تو ہیں" عمران نے کہا "میں سوچ رہا ہوں کہیں بیمار نہ ہو گئے ہوں۔"

"ہمیں اِس سے کیا؟" راشد نے غصّے سے کہا "ہمارے ساتھ وہ کون سا اچھّا سلوک کرتے ہیں جو ہم اُن کی فکر کریں۔"

"پھر کیا ہُوا؟ ہمارے والِدین اور بُزرگ بھی تو ہمیں ڈانٹتے ہیں" عمران نے جواب دیا "اور پھر ہم بھی تو اُن کے گھر کے آگے شور کرتے ہیں۔ میں تو سوچ رہا ہوں کہ پتا کروں۔ آخر انسانی ہمدردی بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔"

"ہوتی ہے تو ہُوا کرے۔ تم ہرگز اُن کے ہاں نہیں جاؤ گے" راشد نے بات ختم کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں بھئی، ہمیں ضرور اُن کا پتا کرنا چاہیے" عمران نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"دیکھو عمران! ضِد نہ کرو۔ تم جانتے ہو کہ ہم اُن سے اور وہ ہم سے کتنی نفرت کرتے ہیں۔ اگر تم اُن کا پتا کرنے گئے تو ہم تمہارا بائیکاٹ کر دیں گے۔ اِسکول بھی اکیلے جاؤ گے۔" راشد نے فیصلہ کُن لہجے میں کہا۔

"شکریہ، دوست" عمران نے کہا "مجھے تو اُمّید تھی کہ تم ایک اچھّی بات میں میرا ساتھ دو گے لیکن افسوس! خیر، کوئی بات نہیں ــــ میں اکیلا ہی چلا جاؤں گا۔"

"تم پچھتاؤ گے" راشد نے دھمکایا۔

"مجھے ایسے پچھتاوے سے خوشی ہو گی" عمران نے دھیمی آواز میں جواب دیا "میں نہیں جانتا کہ نیاز صاحب میرے ساتھ کیسا سلوک کریں گے۔ لیکن میرے دل کو یہ اِطمینان رہے گا کہ میں نے اُن کی فکر کی اور اُن کا پتا کرنے گیا۔"

"ہُونہہ....." راشد مُنہ پھیر کر غصّے سے چلا گیا۔

راشد کے جانے کے بعد عمران سیڑھیاں چڑھ کر اُوپر گیا اور دروازے پر دستک دے کر پُکارا "نیاز صاحِب" لیکن خاموشی رہی۔ جب کئی مرتبہ دستک دینے اور پُکارنے پر بھی کوئی جواب نہیں مِلا تو اُس نے دروازے کو ہلکا سا دھکّا دیا۔ وہ کُھل گیا۔ وہ پہلے تو بغیر اِجازت اندر داخل ہونے سے ہچکچایا، پھر اندر داخل ہو گیا۔ مکان میں دو کمرے تھے۔ ایک کمرے کا دروازہ کُھلا ہُوا تھا۔ وہ سیدھا اُسی کمرے کی طرف بڑھا۔ لیکن دروازے پر پہنچتے ہی بوکھلا کر رُک گیا۔ نیاز صاحِب لیٹے ہوئے تھے۔ اُن کا سر پلنگ کے پاس رکھی ہوئی میز پر تھا اور ایک بازُو یُوں نیچے لٹک رہا تھا جیسے بے جان ہو۔ عمران جلدی سے آگے بڑھا اور زور سے پُکارا:

"نیاز صاحِب! ..... نیاز صاحِب!"

لیکن نیاز صاحِب کے جسم میں کوئی حرکت نہ ہوئی۔ عمران نے اُن کا بازُو تھاما تو وہ آگ کی طرح تپ رہا تھا۔ اُنہیں اپنا کوئی ہوش نہ تھا۔ اُس نے اُنہیں دو تین مرتبہ جھنجھوڑ کر پُکارا لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ اِس پر وہ باہر بھاگا اور جا کر اپنے والِد صاحِب کو سارا ماجرا بتایا۔ وہ ہمسائے کے دو تین آدمیوں کو لے کر آئے اور نیاز صاحِب کو ہسپتال لے گئے۔ رات گئے جا کر اُن کی حالت کچھ سنبھلی۔ لیکن ابھی وہ پوری طرح ہوش میں نہیں تھے۔ عمران اپنے والِد صاحِب کے ہمراہ وہیں ہسپتال میں ٹھہر گیا۔

اگلی صبح تک نیاز صاحِب کی حالت بہتر ہو چکی تھی۔ اپنے آپ کو ہسپتال میں پا کر وہ حیران تھے۔ جب عمران کے والِد نے بتایا کہ یہ سب عمران کی وجہ سے ہُوا ہے تو اُنہیں بہت حیرت ہوئی۔ کچھ دیر بعد عمران کے گھر سے اُن کے لیے ناشتا آ گیا۔ ناشتے سے فارغ ہو کر عمران کے ابّو نے کہا "عمران بیٹے، میں اپنے آفس جا رہا ہوں۔ تم یہیں رہنا۔ میں تمہارے اِسکول فون کر دوں گا۔"

"ٹھیک ہے ابّو" عمران نے کہا۔

کچھ دیر بعد عمران کے ابّو آفس چلے گئے اور کمرے میں عمران اور نیاز صاحب تنہا رہ گئے۔ عمران دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ اگر وہ اپنے ساتھیوں کی بات مان کر نیاز صاحِب کا پتا نہ کرتا تو نہ جانے اُن کا کیا حال ہوتا۔ لیکن اب..... اُس نے سوچا..... میرے ساتھی اگرچہ مُجھ سے خفا ہیں، لیکن مجھے اُن کی خفگی کی کوئی پروا نہیں ہے۔ میں نے جو کچھ کیا اُس پر مجھے فخر ہے۔ وہ اِنہی خیالوں میں گُم تھا کہ نیاز صاحِب کی آواز سُن کر چونک پڑا۔ وہ کہہ رہے تھے:

"بیٹا، میں تمہارا شُکر گزار ہوں۔ لیکن مجھے تمہارے رَوّیے پر حیرت ہے۔ مجھے تم سے ایسی توقّع نہیں تھی کہ تم میری خبر گیری کے لیے آؤ گے۔ میں نے تو تمہارے ساتھ کبھی اچھا سلوک ہی نہیں کیا۔"

"انکل" عمران نے پہلی مرتبہ اُن کا نام لینے سے گُریز کیا "آپ دو دن نظر نہیں آئے تو مجھے تشویش ہوئی کہ کہیں آپ بیمار نہ ہو گئے ہوں۔"

"عمران بیٹا، کیا کبھی بچّے تم جیسے ہوتے ہیں؟"

"نہیں، انکل۔ بچّے اچھّے بھی ہوتے ہیں اور بُرے بھی" عمران نے جواب دیا۔

"ٹھیک کہا تم نے۔ جانتے ہو، میں تمہارے ساتھ اِتنی سختی کے ساتھ کیوں پیش آتا تھا؟" نیاز صاحِب نے سوال کیا، پھر خود ہی بولے "تم کیا جانو۔ جب میں چھوٹا سا تھا، تمہاری عمر کا، تو میرے دو سوتیلے بھائی مُجھ پر بہُت ظلم کرتے تھے۔ اِتنا زیادہ تنگ کرتے تھے کہ میں رو پڑتا تھا۔ ہوتے ہوتے پھر یُوں ہُوا کہ مجھے بچّوں کے نام سے نفرت ہو گئی۔ میں یہی سمجھتا تھا کہ سبھی بچّے ایک ہی طرح کے ہوتے ہیں۔ لیکن میں یہ بھول گیا تھا کہ بچّے تو تمہارے جیسے بھی ہو سکتے ہیں، اور میں خود بھی تو بچّہ تھا، ظلم سہنے والا۔ تم نے، عمران بیٹا، ہاں تم نے میری آنکھیں کھول دی ہیں۔ میں نے تمہیں کئی مرتبہ سخت سُست کہا۔ مجھے معاف کر دینا۔"

"انکل، شرمندہ نہ کریں۔ آپ بڑے ہیں۔ کچھ بھی کہہ سکتے ہیں" عمران نے کُرسی سے اُٹھتے ہوئے کہا "انکل، میں کچھ دیر کے لیے گھر ہو آؤں۔"

"ٹھیک ہے، بیٹے۔"

تین دن کے بعد نیاز صاحِب ہسپتال سے لَوٹے تو اُن میں تبدیلی آ چکی تھی۔ اب وہ بچّوں کو پیار سے دیکھتے ہوئے گزُر جاتے تھے۔ کچھ دن گزُرے تو اُنہیں محسوس ہُوا کہ عمران، جسے وہ اکثر گلی میں کھیلتے ہوئے دیکھتے تھے، اُن کی ہسپتال سے واپسی کے بعد گلی میں نظر نہیں آیا۔ دوسرے بچّے تو ضرور کھیلتے نظر آتے، لیکن وہ غائب ہوتا تھا۔ چُناں چہ شام کو اُنہوں نے عمران کو بُلایا اور جب وہ آیا تو اُنہیں محسوس ہُوا کہ اُس کا چہرہ کچھ اُترا ہُوا ہے۔ اُنہوں نے سوال کیا "عمران، مجھے تمہارے چہرے پر اِفسُردگی سی نظر آ رہی ہے۔ کیا بات ہے؟"

عمران واقعی اپنے ساتھیوں کے بائیکاٹ کی وجہ سے پریشان تھا۔ وہ جب بھی اُن کے پاس گیا، اُنہوں نے اُس کی طرف سے مُنہ پھیر لیا اور اُسے ساتھ کھِلانے سے اِنکار کر دیا۔ اِسکول بھی وہ تنہا جاتا تھا۔ اب جب کہ نیاز صاحِب نے ہمدردی بھرے لہجے میں اُس سے پوچھا تو اُس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اُس نے انہیں ساری بات بتا دی۔ نیاز صاحِب پہلے تو حیرانی سے اُسے تکتے رہے پھر اُس کا بازو تھام کر اُٹھتے ہوئے بولے "آؤ، میرے ساتھ۔ میں تمہارے ساتھیوں سے بات کرتا ہوں۔"

وہ اُسے ساتھ لے کر نیچے گلی میں آئے۔ وہاں اُس کے ساتھی کھیل رہے تھے۔ اُنہوں نے نیاز صاحِب کو دیکھا تو کھیل چھوڑ کر کھڑے ہو گئے۔ نیاز صاحِب نے قریب پہنچ کر کہا "کیا حال ہے بچّو؟"

بچّے خاموش رہے۔ نیاز صاحِب نے راشِد کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا "راشِد بیٹا، میں جانتا ہوں کہ تم لوگ میرے رَوّیے کی وجہ سے مجھ سے ناراض ہو۔ لیکن اگر میں تم لوگوں سے معذرت کر لوں، پھر تو تم عمران سے اپنی ناراضی ختم کر دو گے؟"

راشِد کے ساتھ ساتھ دوسرے لڑکے بھی حیرانی سے اُنہیں دیکھ رہے تھے۔ اُن کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ نیاز صاحِب ایسی بات بھی کہہ سکتے ہیں۔

راشِد نے قدرے شرمندگی سے کہا "انکل، ہمیں افسوس ہے۔ لیکن اُس وقت بات ہی کچھ ایسی تھی کہ ہمیں عمران سے ناراض ہونا پڑا۔ آپ خود....."

"میں جانتا ہُوں، بیٹا۔ تمہیں کچھ بتانے کی ضرورت نہیں" نیاز صاحِب اُس کی بات کاٹ کر بولے "عمران تمہیں بتا دے گا کہ میں کس وجہ سے تم لوگوں کے ساتھ سختی سے پیش آتا تھا۔ اُمید ہے تمہیں اِس کے بعد اُس سے کوئی گِلہ نہیں رہے گا۔" اتنا کہہ کر وہ چلے گئے۔

اُن کے جاتے ہی لڑکوں نے عمران کو گھیر لیا۔ عمران نے اُنہیں ساری بات بتائی تو اُنہوں نے محسوس کیا کہ اُنہوں نے عمران کے ساتھ زیادتی کی تھی۔ راشد بولا "ہمیں معاف کر دو، عمران۔ تم نے واقعی صحیح کیا۔ اگر تم ایسا نہ کرتے تو نیاز صاحِب کبھی اپنا رَوّیہ تبدیل نہ کرتے۔"

اِس کے بعد دِن پھر معمُول پر آ گئے۔ گلی کی رونقیں پھر بحال ہو گئیں۔

چھوئی موئی کے پتّے چھُونے سے مُرجھا کیوں جاتے ہیں؟

چھوئی موئی (Touch-me-not) ایک بہُت حسّاس پودا ہے۔ اِس کے پتّوں کو آپ چھُوئیں گے تو وہ فوراً مُرجھا جائیں گے۔

اِس پودے کے پتّوں میں خاص قسم کے خلیے (Cells) ہوتے ہیں۔ جب کوئی چیز اِن پتّوں سے چھُوتی ہے تو خلیوں کا پانی ایک دم خُشک ہو جاتا ہے، جس سے خلیے سُکڑ جاتے ہیں اور اُن کے سُکڑنے سے پتّے بند ہو جاتے ہیں۔ اِس کے ساتھ ہی پتّوں کا ڈنٹھل پودے کے تنے کی طرف جُھک جاتا ہے۔ اِسے چھوئی موئی کا کُملانا یا مُرجھانا کہتے ہیں۔

تھوڑی دیر بعد پتّوں کے خلیوں میں دوبارہ پانی آ جاتا ہے، جس سے پتّے کھُل جاتے ہیں اور ڈنٹھل بھی تن جاتا ہے۔ اگر پتّوں کو بار بار چھُوا جائے تو کچھ دیر کے لیے پودے کی حسّاسیّت ختم ہو جاتی ہے اور اُس کے پتّے چھُونے سے نہیں مُرجھاتے۔

چھوئی موئی کی کئی قسمیں ہیں۔ یورپ اور امریکا میں اِس کی جو قسم پائی جاتی ہے، اُسے Mimosa کہتے ہیں۔

دُنیا کا سب سے چھوٹا دُودھ پلانے والا جانور کون سا ہے؟

دُنیا کا سب سے چھوٹا میمَل (دُودھ پلانے والا جانور) چُوہے جیسا ایک جانور ہے جسے شرُو (Shrew) کہتے ہیں۔ یہ امریکا اور بحرِ اکاہل کے آس پاس کے علاقوں میں پایا جاتا ہے۔ اِس کا قد اِنسان کی چھوٹی اُنگلی (چھنگلی) کے برابر اور وزن اٹھنّی سے بھی کم ہوتا ہے۔

اگر آپ کسی شرُو کو دیکھیں گے تو وہ ایک ننھا سا چُوہا معلوم ہو گا۔ لیکن یہ چُوہے سے مُختلف ہوتا ہے اور اِس کی ناک چوہے کی ناک سے لمبی اور نوکیلی ہوتی ہے۔ اِس جانور کو ہر وقت بھوک لگی رہتی ہے، اور یہ اپنے وزن سے زیادہ خوراک کھا جاتا ہے۔ اِس کی پسندیدہ خوراک کیڑے مکوڑے اور گھونگھے ہے، جنھیں وہ اپنے تیز دانتوں سے چیر پھاڑ کر ہڑپ کر جاتا ہے۔

ہاتھی کتنی خوراک کھاتا ہے؟

بڑے اور بھاری بھرکم جانوروں کو زیادہ خوراک کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہاتھی دن رات کا زیادہ حِصّہ (تقریباً 18 گھنٹے) کھانے پینے میں گزارتا ہے۔ جنگلی ہاتھی روزانہ آٹھ دس من گھاس پھُوس، درختوں کے پتّے، چھال اور پھل کھا جاتا ہے۔ ہرے بھرے پتّے اِس

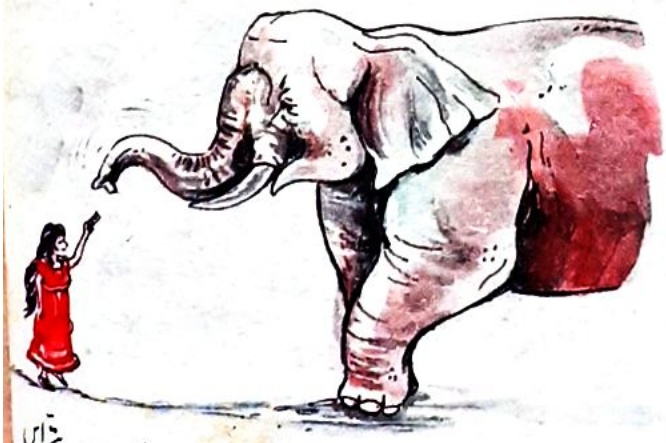

کی محبوب غذا ہے۔ اگر اِس کی سُونڈ پتّوں تک نہ پہنچ سکے تو درخت کو جڑ سے اُکھاڑ دیتا ہے۔

پالتو ہاتھی بہت زیادہ خوراک نہیں کھاتا۔ اِسے گنی چنی خوراک دی جاتی ہے، اور اِس کا وقت مُقرّر ہوتا ہے۔ ایسے ہاتھیوں کو اناج، گھاس، گنّے اور سبزیاں دی جاتی ہیں۔ پالتو ہاتھی گیہوں کی روٹی بھی شوق سے کھاتے ہیں۔

ڈبل روٹی میں سُوراخ کیوں ہوتے ہیں؟

ڈبل روٹی کے سلائس (ٹکڑے) کو غور سے دیکھیے۔ اُس میں سُوراخ نظر آئیں گے۔ یہ سُوراخ گیس کے بُلبلوں سے بنتے ہیں۔

ڈبل روٹی بنانے کے لیے پہلے میدے کو گُوندھا جاتا ہے۔ پھر اُس میں خمیر مِلاتے ہیں۔ خمیر کی یہ خاصیت ہے کہ وہ گیلا اور گرم ہو کر تیزی سے پھُولتا پھیلتا ہے۔ اُس وقت اِس میں خاص قسم کی گیس بنتی ہے جو بُلبلوں کی شکل میں خارج ہوتی ہے۔ یہ خمیر ہی ہے جو ڈبل روٹی کو نرم، پھُولا ہُوا اور مزے دار بناتا ہے۔

کیک میں بھی سوراخ ہوتے ہیں۔ لیکن اِس میں خمیر کے بجائے بیکنگ پاؤڈر ڈالا جاتا ہے جو ٹارٹیرک ایسڈ اور بائی کاربونیٹ آف سوڈا یعنی نمک مِلا کر بنایا جاتا ہے۔ کیک کے مِکسچر میں بیکنگ پوڈر ڈال کر اُسے پکاتے ہیں تو اُس میں کاربن ڈائی آکسائڈ گیس بنتی ہے جو بُلبلوں کی شکل میں باہر نکلتی ہے۔ اِنہی بُلبلوں سے کیک میں سوراخ ہوتے ہیں اور وہ پھول جاتا ہے۔

موتی کیسے بنتے ہیں؟

آپ نے سیپی دیکھی ہوگی۔ یہ ایک سمندری جانور کا خول ہوتا ہے۔ اِس جانور کو صدفہ (Oyester) کہتے ہیں۔ جب صدفہ بچّہ ہوتا ہے تو اُس کا خول نہیں ہوتا اور وہ جیلی کے ایک ننھے سے ٹکڑے کی طرح سمندر کی سطح پر تیرتا پھرتا ہے۔ کچھ دنوں بعد اُس کے جسم کے چاروں طرف خول بننا شروع ہو جاتا ہے۔ جوں جوں خول بڑھتا اور سخت ہوتا ہے، صدفہ بھاری ہوتا جاتا ہے، اور جب زیادہ بھاری ہو جاتا ہے تو سمندر کی تہ میں بیٹھ جاتا ہے۔ یہاں اُسے ایک جگہ ٹکنے کے لیے کسی سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ سہارا عام طور پر کوئی چھوٹی سی چٹان یا جھاڑی وغیرہ ہوتا ہے۔

جب صدفے کو بھوک لگتی ہے تو وہ اپنا خول (سیپی) کھولتا ہے جس سے تھوڑا سا پانی اُس کے اندر چلا جاتا ہے۔ اِس پانی میں ننھے ننھے کیڑے بھی ہوتے ہیں جنہیں وہ کھا جاتا ہے۔

کبھی کبھار ریت کا کوئی ذرّہ پانی کے ساتھ صدفے کے پیٹ میں چلا جاتا ہے۔ یہ ذرّہ صدفے کے پیٹ کی جھلّی میں چُبھتا ہے تو اُسے تکلیف ہوتی ہے۔ اِس چُبھن کو دُور کرنے کے لیے صدفہ کیلسیم کاربونیٹ جیسا لُعاب دار مادّہ خارج کرتا ہے جو اُس ذرّے کے چاروں طرف لپٹ جاتا ہے اور کچھ عرصے بعد سخت ہو جاتا ہے۔ اِس کے بعد صدفہ مزید مادّہ خارج کرتا ہے اور وہ بھی ذرّے کے گِرد لپٹ کر سخت ہو جاتا ہے۔ اِس عمل کو وہ بار بار دُہراتا ہے اور ہر بار لُعاب دار مادّے کی ایک تہ ذرّے پر چڑھ جاتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ ایک بڑا اور خوب صورت موتی بن جاتا ہے۔ لیکن اُس کو موتی بننے میں چار سال لگتے ہیں۔

سب سے قیمتی موتی خلیجِ فارس (پرشین گلف) میں پائے جاتے ہیں۔ اِن کے بعد سری لنکا، خلیج پناما، کیلی فورنیا، مغربی آسٹریلیا اور غربُ الہند (ویسٹ انڈیز) کے موتیوں کا نمبر ہے۔

سمندر کی تہ سے موتی نکالنے والے غوطہ خور صدفوں کو اُسی وقت سمندر سے نکال لیتے ہیں جب وہ بھاری ہو کر تہ میں بیٹھ جاتے ہیں۔ وہ اُن کے خول کھول کر اُن میں ریت کے ذرّے ڈال دیتے ہیں اور پھر اُنہیں تالاب میں چھوڑ دیتے ہیں۔ اِس طرح اُنہیں بہت سے موتی مِل جاتے ہیں۔ اِنہیں قُدرتی موتی کہتے ہیں اور یہ بہت مہنگے داموں بِکتے ہیں۔ مصنوعی موتی مصنوعی طریقوں سے بنائے جاتے ہیں اور یہ بہت سستے ہوتے ہیں۔ (س۔ ل)

رُومال گناہ

ڈاکٹر محمد رفیق

مجھے اپنی صحیح تاریخِ پیدائش تو معلوم نہیں البتہ جب ذرا سیانا ہُوا تو مجھے بڑے چاؤ سے پہلی جماعت میں داخل کروا دیا گیا، جہاں ساری جماعت ٹاٹ پر بیٹھا کرتی تھی۔ چُھٹی کے قریب کلاس کے لڑکے اُونچے سروں میں پہاڑے یاد کیا کرتے تھے۔ پہلے پہل تو میں اِس شور سے گھبرایا کرتا تھا، لیکن رفتہ رفتہ اِس کا عادی ہو گیا۔ میں ایک عام سا لڑکا تھا اِس لیے ماسٹر صاحِب باقی سب لڑکوں کی طرح مُجھ سے برابری کا سلوک فرماتے جس میں ڈنڈے کا اِستعمال بھی شامل تھا۔

تیسری جماعت میں پہنچا تو ایک نیا لڑکا ہماری جماعت میں داخِل ہُوا۔ اُس کا نام محمد عاشِق تھا۔ وہ شروع ہی سے پڑھائی میں بے حد ہوشیار تھا۔ میرے والدِ مُحترم حافظِ قرآن تھے اور انھیں اِس بات کا بے حد شوق تھا کہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کروں۔ چُناں چہ وہ مجھ پر خوب توجُّہ فرماتے۔ اِس لیے میں بھی پڑھائی میں خاصا ہوشیار ہو چکا تھا۔ میری طرح محمد عاشِق کا تعلق بھی درمیانہ طبقے سے تھا۔ آہستہ آہستہ ہماری دوستی پکّی ہو گئی مگر ہمارے درمیان نمبر لینے کا مُقابلہ جاری رہا۔

کھیلتے کُودتے، دوستی کے مزے اُڑاتے ہم پانچویں جماعت میں آ گئے۔ اِس جماعت میں ماسٹر خوشی محمد صاحِب ہمارے اِنچارج تھے۔ وہ پُورے پرائمری حصّے کے بھی اِنچارج تھے۔ اِنتظامی اُمور کے سلسلے میں اُن کو اکثر ہیڈ ماسٹر صاحِب کے دفتر میں جانا پڑتا تھا۔ انھیں جب بھی اچانک کہیں جانا پڑ جاتا تو وہ مجھے یا عاشق کو کلاس کا خیال رکھنے کو کہہ جاتے۔ تھوڑی دیر کے لیے تو ہم طُلبا پر قابُو پا لیتے۔ مگر تھے تو ہم بھی بچّے ہی، اِس لیے خود بھی اُن میں شامل ہو جاتے اور کاغذ کی گولیاں بنا بنا کر ایک دوسرے پر پھینکتے۔ جب اُستادِ مُحترم کلاس کے نزدیک پہنچتے تو زور زور سے قدم زمین پر مارتے۔ یہ اُن کے آنے کا اِعلان ہوتا تھا۔ جب وہ جماعت میں آتے تو کاغذ کی گولیاں ایک لمحے میں فرش سے غائب ہو جاتیں اور ہم سب ہِل ہِل کر سابق یاد کر رہے ہوتے۔ واقعی خوشی محمد صاحِب بڑے رُعب داب کے اُستاد تھے۔

پڑھائی میں مَیں اور محمد عاشِق تقریباً برابر تھے مگر اِمتحان میں وہ ہمیشہ مجھے دو چار نمبروں سے پچھاڑ دیتا۔ یہی کچھ پانچویں کے سالانہ اور وظیفے کے اِمتحان میں ہُوا۔ ہم دونوں نے وظیفہ حاصل کیا مگر وہ مُجھ سے دو چار نمبر زیادہ لے کر جماعت میں اوّل رہا اور میں دوم۔ مجھے اِس کا دُکھ ضرور ہُوا مگر چُوں کہ محمد عاشِق میرا دوست تھا اِس لیے میں نے اِس دُکھ کا اِظہار نہ ہونے دیا۔ جب ہم چھٹی جماعت میں پہنچے تو وہ واقِعہ پیش آیا جس نے میری زندگی پر گہرا اثر ڈالا۔

چھٹی جماعت میں ماسٹر عبدُاللہ صاحِب انگریزی پڑھاتے تھے۔ چُوں کہ ہمارے اِسکول میں انگریزی کی تعلیم چھٹی جماعت سے شروع ہوتی تھی اِس لیے یہ ہمارے لیے بڑی اہم

بات تھی۔ ہم سب ماسٹر عبُداللہ صاحِب کی شفقت بھری نظروں کے مُنتظِر رہتے تھے۔ عبُداللہ صاحب جسمانی لحاظ سے نہایت کم زور آدمی تھے۔ اِسکول میں یہ افواہ بھی پھیلی ہوئی تھی کہ اُنہیں پھیپھڑوں کی بیماری ہے اور وہ اِس بیماری کا علاج کروا رہے ہیں۔ وہ بڑی مشکل سے جماعت میں آتے۔ اِس بیماری کے باوجود وہ انگریزی بہُت اچھّی پڑھاتے تھے۔ اَسباق کو اِتنا آسان بنا دیتے کہ اُنہیں سمجھنے میں ہمیں کوئی دُشواری پیش نہ آتی۔

چھٹی کے سہ ماہی اِمتحان میں محمّد عاشِق کا پلّا بھاری رہا۔ سہ ماہی اِمتحان کے چند دن بعد ماسٹر عبُداللہ ہمیں پڑھا رہے تھے کہ ایک دم اُن کی سانس بے قابُو ہو گئی۔ اُنہوں نے پانی مانگا اور زور زور سے کھانسنے لگے۔ کھانسی نے جب زیادہ شِدّت اِختیار کی تو اُنہوں نے جیب سے رومال نکال کر مُنہ پر رکھ لیا۔ کھانسی اِس قدر شدید تھی کہ اُن کی رنگت پیلی پڑ گئی تھی۔

رومال بھی گندہ ہو گیا تھا۔

اِتنے میں کلاس کا ایک لڑکا بھاگ کر گلاس میں پانی لے آیا۔ ماسٹر عبُداللہ صاحِب نے چند گھُونٹ پانی پیا تو اُن کی طبیعت کچھ سنبھل گئی۔ اُنہوں نے محمّد عاشِق کو آواز دی اور اپنا رومال دھونے کو کہا۔ اُس نے اپنی اُنگلی زخمی ہونے کا بہانہ کر دیا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کراہت کی وجہ سے رومال نہیں دھونا چاہتا یا اُس کو یہ ڈر ہے کہ کہیں ماسٹر صاحِب کی بیماری کے جراثیم اُسے نہ لگ جائیں۔

محمّد عاشِق کے اِنکار کے بعد میں فوراً اپنی جگہ سے اُٹھا اور ماسٹر صاحِب کا رومال دھونے کے لیے چلا گیا۔ واپس آ کر میں نے ماسٹر صاحب کی طرف دیکھا تو اُن کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں اور ہونٹ ہِل رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ میرا شکریہ ادا کرنا چاہتے ہیں لیکن زبان ساتھ نہیں دے رہی۔

میں اپنی سیٹ پر جانے کے لیے مُڑا ہی تھا کہ اچانک اُن کی طبیعت پھر بگڑ گئی اور وہ بے دم ہو کر نیچے گر گئے۔ وہ آہستہ آہستہ کچھ بُڑبُڑا رہے تھے۔ میں نزدیک کھڑا تھا۔ اِس لیے میں نے اُن کے وہ فقرے سُن لیے۔ وہ میری کامیابی کی دُعا فرما رہے تھے اور اللہ تعالیٰ سے اِلتجا کر رہے تھے کہ میں ساری زندگی رزقِ حلال کماؤں۔ میں فوراً بھاگا اور ہیڈ ماسٹر صاحِب کو بُلا لایا۔ عبُداللہ صاحِب کو اُن کے گھر پہنچا دیا گیا جہاں اگلی صبح اُن کا اِنتقال ہو گیا۔

اِس واقعے کے بعد نہ تو مُجھے عبُداللہ صاحِب کی وہ بیماری لگی، نہ سال ہا سال تک کسی اور بیماری نے مُجھ پر حملہ کیا۔ البتہ اس واقعے کا یہ اثر ضرور ہُوا کہ تعلیمی میدان میں محمّد عاشق اِس کے بعد میری گرد کو بھی نہ چھُو سکا۔ میں تعلیم مکمّل کر کے ایک کالج میں لیکچرار لگ گیا اور پھر برطانیہ سے فزِکس میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی، اور اللہ کی ذات اب تک مجھے رزقِ حلال عطا فرما رہی ہے۔

ہمارے محلّے میں چوری ہو گئی۔ گزشتہ بیس برس میں یہ پہلا موقع تھا کہ یہاں چوری ہوئی تھی۔ ہمارا محلّہ اندرونِ شہر کی ایک تنگ و تاریک گلی میں ہے۔ یہاں چھوٹے چھوٹے گھر ہیں اور سب ایک دوسرے سے مِلے ہوئے ہیں۔ اگر کوئی شخص کسی گھر کی چھت پر پہنچ جائے تو آخری گھر تک جا سکتا ہے۔ گلی اِتنی تنگ ہے کہ اُس میں کار داخل نہیں ہو سکتی۔

چوری کی واردات ایک ریٹائرڈ سرکاری افسر نذیر خاں صاحِب کے گھر ہوئی تھی۔ اُس رات وہ بیوی بچّوں کے ساتھ شادی میں گئے ہوئے تھے۔ گھر میں کوئی نہیں تھا۔ وہ لوگ رات کو دو بجے کے قریب لوٹے تو اُن کے کمرے کا دروازہ چوپٹ کُھلا ہوا تھا۔ بیگم نذیر جلدی سے کمرے میں گئیں اور لوہے کی الماری کو دیکھا تو اُس کا تالا بھی ٹُوٹا ہوا تھا۔ کسی نے الماری کی تلاشی لی تھی اور کپڑوں کے نیچے رکھے ہوئے تمام روپے نکال لیے تھے۔ اُنھوں نے گھبرا کر الماری کا سیف دیکھا تو وہ بھی ٹُوٹا ہوا تھا اور اُس میں رکھے ہوئے تمام زیورات غائب تھے۔ یہ زیورات اُنھوں نے لڑکی کی شادی کے لیے تھوڑے تھوڑے کر کے جمع کیے تھے۔ لڑکی کی شادی چار ماہ بعد تھی۔

بیگم نذیر تو چکرا کر گر پڑیں اور نذیر صاحِب اور اُن کے بچّوں نے شور مچا کر سارا مُحلّہ اِکٹھا کر لیا۔ اب ڈھائی بج رہے تھے اور اِس وقت تھانے جانا بے کار تھا۔ اِس لیے پڑوسی اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے اور نذیر صاحب اور اُن کی بیوی بچّے صبر شکر کر کے سونے کی کوشش کرنے لگے۔

دوسرے دن صُبح کو تھانے جاتے ہوئے نذیر صاحب نے مُجھے اور شاہد احمد کو بھی ساتھ لے لیا۔ ہم تھانے پہنچے تو اِنسپکٹر شہر یار اپنے کمرے میں موجود تھا۔ نذیر صاحب ریٹائرڈ سرکاری افسر تھے اور محلّے میں اُن کی بڑی عزّت تھی۔ اِس لیے انسپکٹر ان سے بہت تپاک سے مِلا اور ہاتھ مِلا کر بولا "کہیئے، کیسے تکلیف کی؟"

"کل رات میرے گھر چوری ہو گئی ہے" نذیر صاحِب نے کہا۔

"چوری!" انسپکٹر نے حیرت سے کہا "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ آپ کی گلی کے دونوں طرف میرے آدمی پہرے پر تھے۔ چور اندر کیسے داخل ہُوا؟"

"ہو سکتا ہے وہ سو گئے ہوں" میں نے کہا۔

"ارے نہیں، آصف صاحب۔ چار آدمی پہرے پر تھے۔ دو ایک طرف، دو دوسری طرف۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ دونوں ہی سو گئے ہوں؟ خیر، میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔"

نذیر صاحب کے گھر جا کر انسپکٹر شہریار نے جائے واردات کا بغور معاینہ کیا، الماری پر انگلیوں کے نشانات تلاش کیے اور بولا "میں چھت پر جانا چاہتا ہوں۔"

"چلیے۔ اُس طرف" نذیر صاحب ہمیں لے کر چھت کے زینے کی طرف بڑھے۔ زینے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔

"ارے!" نذیر صاحب نے حیرت سے کہا "یہ کیسے کھل گیا؟"

"اسے چور نے کھولا تھا" انسپکٹر نے اطمینان سے جواب دیا "اُس نے دھکا دے کر اُس کی کنڈی توڑ دی۔"

میں نے کہا "آپ کا مطلب ہے کہ چور اُوپر سے آیا تھا؟"

"جی ہاں" انسپکٹر نے کہا "نذیر صاحب کے گھر میں داخل ہونے کے دو ہی راستے ہیں، ایک اُوپر سے، دوسرا باہر سے۔ باہر سے تو کوئی نہیں آیا، کیوں کہ کل رات نذیر صاحب کو باہر لگا ہُوا تالا جُوں کا توُں ملا تھا۔ اب یہی ایک راستہ رہ جاتا ہے۔"

"لیکن چور کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ نذیر صاحب باہر جا رہے ہیں اور رات کو دیر سے واپس آئیں گے؟" میں نے پوچھا۔

"بات یہ ہے، آصف صاحب کہ چور اسی محلّے میں رہتا ہے" انسپکٹر نے مسکرا کر کہا۔

"اسی محلّے میں؟" نذیر صاحب نے چلّا کے کہا "ارے نہیں جناب۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ یہاں سب شریف لوگ رہتے ہیں۔"

"جُرم کرنے سے پہلے ہر مُجرم شریف ہوتا ہے" انسپکٹر نے کہا اور پھر چھت پر ٹہلنے لگا "آپ کی چھت پر آنے کے تین راستے ہیں۔ ایک دائیں جانب سے، دوسرا بائیں جانب سے اور تیسرا پیچھے سے۔ تیسرا راستہ ذرا مشکل ہے کیونکہ پیچھے والوں کی چھت آپ سے کافی نیچی ہے" انسپکٹر نے پیچھے والوں کے گھر جھانکا "لیکن اگر لمبی سی سیڑھی لگائی جائے تو بات بن سکتی ہے۔ چور آپ کی لائن میں رہتا ہے۔"

"یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں؟" میں نے پوچھا "ہمارے محلّے کے لڑکے چھلانگ لگا کر گلی پار کر لیا کرتے ہیں۔"

"یقیناً" انسپکٹر نے کہا "لیکن یہ کام کسی لڑکے کا نہیں ہے۔ کیونکہ لڑکوں کی دلچسپی کی چند چیزیں نذیر صاحب کے گھر میں موجود تھیں۔ مثلاً ٹیپ ریکارڈر اور وی سی آر وغیرہ۔ یہ چیزیں محفوظ ہیں۔ صرف نقدی اور زیورات گم ہوئے ہیں۔ لہٰذا یہ کام کسی بڑی عُمر والے کا ہے۔"

میں نے دل ہی دل میں انسپکٹر کی ذہانت کی داد دی اور کہا "آپ کا اندازہ بالکل دُرست ہے۔"

"نذیر صاحب، آپ لوگ فی الحال اُس الماری کو ہاتھ نہ لگائیے گا۔ اُوپر بھی کسی کو نہ جانے دیجیے گا۔ یہاں صرف میرے آدمی آئیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ ایک دو دِنوں میں آپ کا چور پکڑا جائے گا۔ میں فی الحال آپ کے محلّے داروں کا انٹرویو لُوں گا۔"

"اللہ آپ کی زبان مُبارک کرے" نذیر صاحب نے کہا "آپ انٹرویو کب لیں گے؟"

"آج ہی شام کو" انسپکٹر نے مسکرا کے کہا۔

محلّے کے تمام بُزرگ شام کو ٹھیک پانچ بجے انسپکٹر شہریار کے کمرے میں جمع ہو گئے۔ انسپکٹر نے صرف اُن لوگوں کو بُلایا تھا جو نذیر صاحب کے گھر کی لائن میں رہتے تھے۔ جب سب لوگ آ گئے تو انسپکٹر نے کہا "آپ لوگ اپنے مکان نمبر کے حساب سے بیٹھ جائیں۔" سب لوگ انسپکٹر کی ہدایت کے مُطابق بیٹھ گئے۔

"جی، رحمت علی صاحب" اُس نے پہلے شخص کو مُخاطب کیا "آپ یہ بتائیں کہ کل رات بارہ بجے کے آس پاس آپ کیا

کر رہے تھے؟"

"جی؟" رحمت صاحب گھبرا گئے "مم میں سو رہا تھا، شاید۔

"شاید کیا مطلب؟" انسپکٹر نے پوچھا۔

"میرا مطلب ہے کہ میں نے سونے سے پہلے گھڑی نہیں دیکھی تھی" رحمت صاحب بولے۔

"آپ چھت پر سوتے ہیں؟"

"جی نہیں۔ کمرے میں۔"

"باقی گھر والے آپ سے پہلے سو گئے تھے؟" انسپکٹر نے پوچھا۔

"جی ہاں۔ دفتر کا کچھ کام تھا۔ وہ ختم کر کے سویا تھا۔"

میں رحمت علی کو عرصے سے جانتا ہوں، وہ چور نہیں ہو سکتا تھا۔ انسپکٹر نے بھی شاید یہی فیصلہ کیا۔ اب وہ دوسرے شخص سے مخاطب ہوا "رحیم صاحب، آپ کل رات بارہ بجے کیا کر رہے تھے؟"

"ہم سب گھر والے رات کو ٹی وی پر خبرنامہ سن کر سو جاتے ہیں۔"

"خوب!" انسپکٹر بولا "آپ چھت پر سوتے ہیں؟"

"جی ہاں۔ میرے دونوں بیٹے البتہ نیچے سوتے ہیں۔

"وہ نیچے کیوں سوتے ہیں؟"

"نئی پود ہے، جناب۔ تازہ ہوا بُری لگتی ہے اُنہیں" رحیم صاحب نے مسکرا کے کہا۔

انسپکٹر بھی مسکرانے لگا۔ پھر وہ تیسرے آدمی کی طرف متوجہ ہوا "راشد صاحب، آپ اپنے بارے میں بتائیں۔"

"ہم بڑے تو سو گئے تھے البتہ بچے جاگ رہے تھے۔ میرے بڑے لڑکے اور لڑکی کے امتحان ہو رہے ہیں۔ وہ دونوں پڑھ رہے تھے۔ چھوٹا لڑکا میٹرک کی تیاری کر رہا ہے۔ وہ بھی اُن کے ساتھ پڑھ رہا تھا۔"

"آپ لوگ چھت پر سوتے ہیں؟"

"جی نہیں۔ کمروں میں۔ اُوپر مچھر بہت تنگ کرتے ہیں۔

"مظفر صاحب، آپ بتائیے" انسپکٹر چوتھے آدمی کی طرف متوجہ ہوا۔

"ہم سب گھر والے چھت پر سوتے ہیں۔ ہمارے ہاں کوئی کمروں میں نہیں سو سکتا۔ یہاں تک کہ ہمارا کتا بھی کھلی فضا کا عادی ہے" مظفر صاحب نے ہنس کے کہا۔

"خوب!" انسپکٹر مسکرایا "یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ تو گویا آپ سو رہے تھے۔"

مظفر بھی میرا بہت اچھا دوست ہے۔ وہ چور نہیں ہو سکتا تھا۔ مظفر کے ساتھ نذیر صاحب بیٹھے تھے۔ اُن سے کچھ پوچھنا بے کار تھا۔ اُن کے ساتھ شاہد احمد تھا۔ انسپکٹر اُس کی جانب متوجہ ہوا تو وہ بولا "میرے گھر میں صرف دو افراد ہیں۔ میں اور میری بیوی۔ ہم دونوں رات گئے تک ٹی وی دیکھتے رہتے ہیں۔ کل فلم دیکھ رہے تھے جو پونے ایک بجے ختم ہوئی۔"

شاہد سے ملا ہوا گھر میرا ہے۔ انسپکٹر نے مجھے مخاطب کیا "جی، آصف صاحب۔ اب آپ فرمائیے۔"

"میں کل ایک پارٹی میں گیا تھا جو ایک بجے تک چلی۔ میری بیوی اور بیٹی البتہ گھر پر تھے" میں نے کہا۔

"وہ دونوں چھت پر سوتے ہیں؟"

"جی نہیں، کمرے میں سوتے ہیں۔"

انسپکٹر کا چہرہ میرے ساتھ بیٹھے ہوئے امجد خان کی طرف مڑ گیا۔ امجد خان ہمارے محلے کی ایک بہت بزرگ شخصیت ہیں۔

"امجد صاحب، آپ؟"

"میں اور میرا بڑا بیٹا تو اُوپر ہی سوتے ہیں" امجد صاحب نے کہا "بچے نیچے دھما چوکڑی مچاتے رہتے ہیں۔ میری نیند دراصل کچی ہے۔ ذرا سی آہٹ سے آنکھ کھل جاتی ہے۔"

"اکرام صاحب، آپ کیا کہتے ہیں؟" انسپکٹر نے امجد صاحب کے برابر بیٹھے ہوئے ایک صاحب سے پوچھا۔

"ہم لوگ رات کو دیر سے سونے کے عادی ہیں۔ رات گئے تک گپیں ہانکتے رہتے ہیں۔ کل رات بھی ہم کافی دیر تک گپیں مارتے رہے" اکرام صاحب نے جواب دیا۔

"یہ گپیں آپ چھت پر بیٹھ کر مارتے ہیں یا کمرے میں؟" اِنسپکٹر شہریار نے پوچھا۔

"جی، کمرے میں۔"

"اور آپ، رحمانی صاحِب؟" اِنسپکٹر نے آخری آدمی سے پُوچھا۔

"میں تو جناب، جلدی سو جاتا ہوں۔ کل رات بھی جلد ہی سو گیا۔ چھت پر سوتا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ باقی گھر والے کب تک جاگتے رہے؟" رحمانی نے کہا۔

"وہ بھی چھت پر سوتے ہیں؟"

"جی نہیں۔ وہ کمرے میں سوتے ہیں۔"

تمام لوگ پُورے ہو گئے اور بظاہر کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ مُعاملہ کافی پیچیدہ تھا۔ اِنسپکٹر سوچنے کے انداز میں سر ہلانے لگا۔ پھر اُس نے کسی کو آواز دی "نذر محمّد!" ایک سپاہی اندر داخل ہوا۔

"آپ لوگ بیٹھیں۔ میں ابھی حاضر ہُوا" اِنسپکٹر کھڑا ہو گیا "اور تم نذر محمّد، میرے ساتھ آؤ۔"

دونوں کمرے سے باہر نکل گئے۔ ہم سب ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ ہر کوئی دوسرے پر شک کر رہا تھا۔ لگتا تھا کمرے میں سب چور بیٹھے ہیں۔

اِنسپکٹر شہر یار فوراً ہی واپس آ گیا۔ وہ کسی سوچ میں ڈُوبا ہُوا تھا۔ اُس نے ہم سے کہا "اب آپ لوگ جا سکتے ہیں۔ آپ کی تشریف آوری کا بُہت بہت شکریہ۔ بس ذرا ایک کام کرتے جائیں۔ میں آپ میں سے ہر ایک کو کاغذ اور پنسل دے رہا ہوں۔ آپ اُس پر اپنا اور اپنے گھر کے اَفراد کے نام لکھ دیں اور ساتھ ہی اُن کی عمریں بھی۔"

اُس نے سب کے سامنے ایک ایک کاغذ اور ایک ایک پنسل رکھ دی۔ ہم نے اُس پر نام لکھے اور اُٹھ کھڑے ہوئے۔

"اگر آپ لوگوں کو تکلیف نہ ہو تو کل بھی اِسی وقت تشریف لے آئیے گا۔ میں ممنُون ہوں گا" اِنسپکٹر نے کہا۔

اگلے چوبیس گھنٹے تک ہر شخص یہی سوچتا رہا کہ چور کون ہو سکتا ہے۔ نذیر خاں صاحِب نے تمام گفتگو سُن کر کہہ دیا تھا کہ چور ضرور کوئی باہر کا آدمی ہے۔ لیکن پھر وہ پہرے دار؟ کیا وہ چور سے ملے ہوئے تھے؟

اگلے دن پانچ بجے ہم پھر اِنسپکٹر شہریار کے کمرے میں موجود تھے۔ اُس نے مسکرا کر کہا "میں نے آپ کے چور کا پتا لگا لیا ہے۔"

"ارے!" سب حیران رہ گئے۔

"کون ہے وہ؟" میں نے پوچھا۔

"بتاتا ہوں، آصف صاحب۔ ذرا صبر کریں" اِنسپکٹر نے کہا۔ پھر وہ تھوڑا رُک کر بولا "کل آپ لوگوں سے جو گُفت گُو ہوئی تھی، اُس سے مجھے ایک شخص پر شک ہو گیا تھا۔"

"کس پر؟" شاہد نے پوچھا۔

"دیکھیے۔ نذیر صاحِب کے دائیں جانب چار مکان ہیں اور بائیں جانب پانچ۔ میں نے ہر ایک سے یہ بھی پوچھا تھا کہ وہ

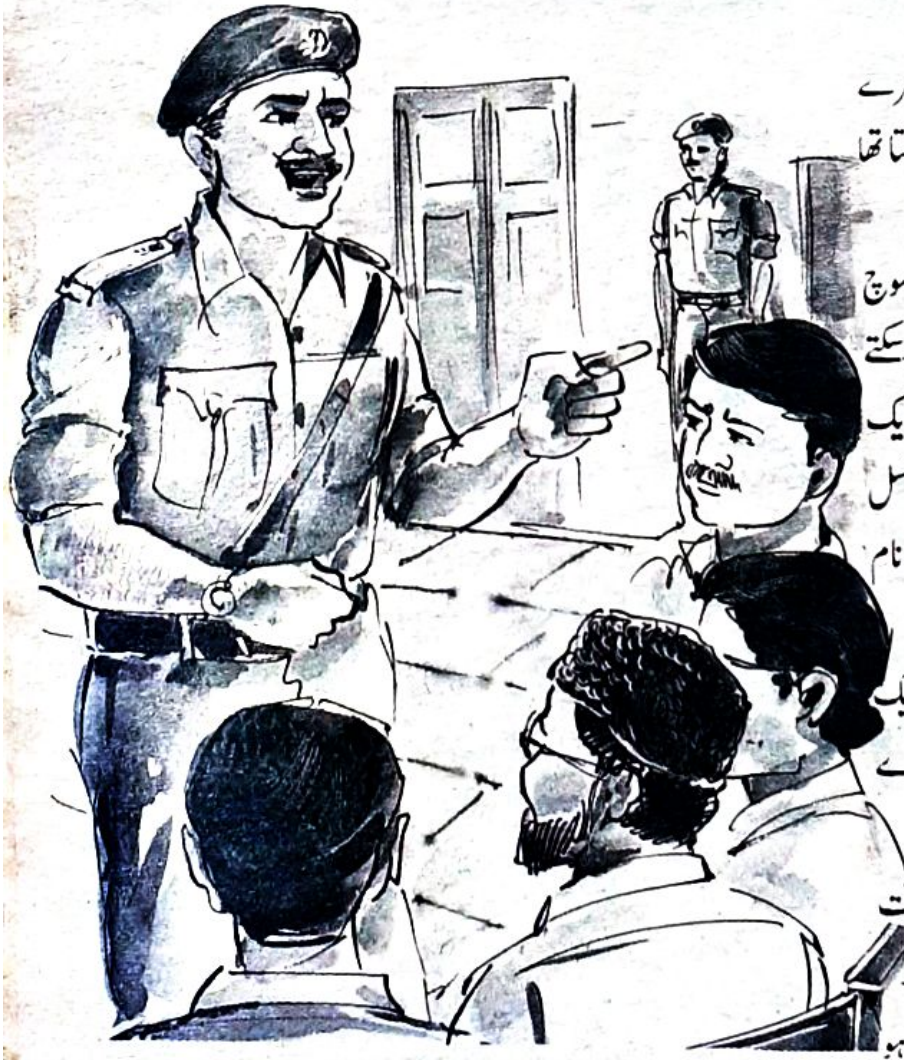

چھت پر سوتا ہے یا کمرے میں۔ نذیر صاحب کے بالکل برابر مُظفّر صاحب رہتے ہیں۔ یہ سب لوگ چھت پر سوئے اور خاص بات یہ ہے کہ اُن کا کُتّا بھی چھت پر تھا۔ اگر چور مُظفّر صاحب کے گھر سے ہو کر آتا تو کتّا ضرور بھونکتا۔ مگر ایسا نہیں ہُوا۔ چور مظفّر صاحب کا گھر پھلانگ کر نہیں آیا۔ لہٰذا مُظفّر صاحب ہی چور ہو سکتے ہیں۔"

"کک، کیا مطلب؟" مُظفّر صاحب بُوکھلا گئے۔

"میں نے یہ نہیں کہا کہ آپ چور ہیں البتہ آپ پر شک کیا جا سکتا ہے۔ اب نذیر صاحب کے بائیں جانب جو پانچ مکان ہیں، اُن میں سے ایک میں امجد صاحب رہتے ہیں جو چھت پر سوئے تھے۔ اِن کی نیند بہت کچّی ہے۔ ذرا سی آہٹ سے اِن کی آنکھ کھُل جاتی ہے۔ اِس کا مطلب ہے کہ چور اِن کا گھر پھلانگ کر بھی نہیں آیا۔ لہٰذا امجد صاحب یا اِن کے گھر میں سے کوئی چور ہو سکتا ہے۔"

امجد صاحب نے کچھ کہنا چاہا لیکن اِنسپکٹر نے اُنہیں خاموش رہنے کا اِشارہ کیا۔

"امجد صاحب کے ساتھ آصف صاحب کا گھر ہے۔ اِنہیں نذیر صاحب کے گھر جانے کے لیے امجد صاحب کی چھت نہیں پھلانگنی پڑے گی۔ لہٰذا یہ بھی چور ہو سکتے ہیں۔ پھر نذیر صاحب سے مِلا ہُوا مکان شاہد احمد صاحب کا ہے۔ وہ بھی چور ہو سکتے ہیں۔ تو حضرات مُعاملہ نو میں سے چار پر آ گیا۔" میں نے دل ہی دل میں انسپکٹر کی ذہانت کی داد دی۔

"پھر میں نے آپ سے ....." اِنسپکٹر کا جُملہ ادھورا رہ گیا کیوں کہ اُسی وقت ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تھی۔ اِنسپکٹر نے ریسیور اُٹھایا۔ دوسری طرف سے کچھ سُن کر تھوڑی دیر تک ہُوں ہاں کرتا رہا۔ پھر ریسیور رکھ کر بولا "حضرات، میں معذرت چاہتا ہُوں۔ بس ابھی تھوڑی دیر میں حاضِر ہُوا۔" یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔ کمرے میں ایک بار پھر خاموشی طاری ہو گئی۔ جو لوگ بُری ہو گئے تھے وہ خوش اور مُطمئن نظر آ رہے تھے اور ہم چاروں کو شک بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ اِنسپکٹر قریباً پندرہ مِنٹ بعد واپس آیا۔

"معافی چاہتا ہوں" وہ کُرسی پر بیٹھ کر بولا "ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ پھر میں نے آپ سے آپ کے گھر والوں کے نام لِکھوائے۔ ہر ایک کو علیٰحدہ کاغذ اور علیٰحدہ پنسل دی تاکہ آپ کی اُنگلیوں کے نشانات حاصل کر لوں۔ میں اِس سے پہلے اپنے مُحرّر سے یہ پُوچھ آیا تھا کہ اُنگلیوں کے نشانات کی رپورٹ آ گئی ہے۔ لہٰذا میں نے اُن چار لوگوں کی اُنگلیوں کے نشانات نذیر صاحب کی الماری کے تالے پر لگے ہوئے نشانات سے ملائے۔ لیکن بدقسمتی سے نذیر صاحب کے گھر والوں نے ہم سے پہلے ہی تالے کو ہاتھ لگا دیا تھا اور تالے پر بہت سی اُنگلیوں کے نشانات تھے۔ چور کوئی عادی مُجرِم نہیں ہے لہٰذا پولیس کے پاس اُس کی اُنگلیوں کے نشانات کا کوئی ریکارڈ نہیں۔ لیکن ایک شخص پر میرا شک خاصا پُختہ تھا۔ تو جناب، آپ لوگوں کو یہاں بِٹھا کر میں نے اپنے آدمی اُس شخص کے گھر بھیجے اور ــــ آصف صاحب کے گھر سے چوری کا سامان نکل آیا" اِنسپکٹر نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ شاید بھول گئے کہ میں پرسوں ایک پارٹی میں شریک تھا" میں نے کہا۔

"یہی وہ بات ہے جس نے میرے شک کو پُختہ کیا۔ صرف آپ وہ شخص ہیں جو واردات کی رات گھر سے باہر تھے۔ شاید اِس لیے کہ آپ اپنی بے گناہی ثابت کر سکیں۔ مگر اِسی چیز نے آپ کو مشکوک کر دیا ــــ لہٰذا آصف صاحب، میں آپ کو گرفتار کرتا ہُوں!"

اِنسپکٹر شہریار واقعی بہت ذہین آدمی ہے۔ اُس نے چوری کا سُراغ اِتنی آسانی سے لگا لیا کہ میں حیران رہ گیا۔ اب میں یہ کہانی جیل کی کال کوٹھڑی میں بیٹھ کر لِکھ رہا ہُوں اور اُس وقت کو کوس رہا ہوں جب اِس جُرم کا خیال میرے ذہن میں آیا تھا۔

Sharjeel Ahmed

Sharjeel Ahmed

Excellent

شیش ناگ

محمد اِقبال ثاقب

دن بھر سفر کرنے کے بعد خُدا بخش جوگی اپنے مختصر خاندان کے ساتھ بہاول پور کے ایک گاؤں کے قریب پہنچ گیا۔ یہاں اُس نے اپنے اکلوتے بیٹے اکبر کے ساتھ مِل کر خیمہ لگایا۔ اکبر کی بُوڑھی ماں بھی اپنے شوہر کا ہاتھ بٹاتی رہی۔ شام ہونے کے قریب تھی کہ اُنھوں نے اپنا کام ختم کر لیا۔ اِس علاقے کی زمین بنجر تھی، اِس لیے چاروں طرف ویرانی پھیلی ہوئی تھی۔ کہیں کہیں گھاس پھوس اور جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔ جیسے جیسے شام ہو رہی تھی ہر طرف خوفناک خاموشی چھاتی جا رہی تھی۔

خُدا بخش اِس علاقے میں ایک بہت قیمتی سانپ، شیش ناگ، کی تلاش میں آیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اُسے جس سانپ کی تلاش ہے وہ ایسے ہی ویران علاقے میں مِل سکتا ہے۔ وہ بہت پُراُمید تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اگر شیش ناگ مِل گیا تو اُس کی قسمت بدل جائے گی۔ وہ ایک مہینے کا راشن لے کر یہاں آیا تھا۔

وہ روزانہ صبح سویرے کندھے پر جھولی لٹکا کر نکل کھڑا ہوتا اور اِدھر اُدھر بین بجاتا پھرتا۔ کئی دفعہ تو وہ پانچ پانچ، چھ چھ میل دُور نِکل جاتا اور تھک ہار کر شام کو واپس آتا۔ اکبر، جس کی عمر تقریباً 10 سال تھی، اپنی بُوڑھی ماں کے پاس رہتا اور اپنے باپ کی غیر موجودگی میں پٹاریوں میں بند سانپوں کی خوراک وغیرہ کا خیال رکھتا۔ وہ اُن سانپوں سے بڑا مانوس تھا۔ جوگی کا بیٹا ہونے کی وجہ سے وہ سانپوں سے بالکل نہیں ڈرتا تھا۔ خوراک ڈالتے وقت اگر کوئی سانپ پٹاری سے باہر نِکل جاتا تو وہ اُسے پکڑ کر پٹاری میں ڈال دیتا۔

خُدا بخش کو یہاں آئے ہوئے کافی دِن گُزر گئے تھے۔ ایک شام جب وہ واپس لوٹا تو اُس کی بیوی بولی ”لگتا ہے آج بھی خالی ہاتھ لوٹے ہو؟“

”تم ٹھیک کہتی ہو، بھاگوان۔ میں نے اِس علاقے کا چپّا چپّا چھان مارا ہے۔ لگتا ہے ابھی قسمت ہمارا ساتھ نہیں دے رہی“ خُدا بخش نے جواب دیا۔

”میں تو کہتی ہوں شیش ناگ کا خیال چھوڑ دو۔ آٹا بھی اب تھوڑا سا رہ گیا ہے۔ اب ہمیں کسی شہر کا رُخ کرنا چاہئے“ جوگن نے کہا۔

”میں ابھی بالکل نااُمید نہیں ہوا۔ ایک دفعہ آخری کوشش ضرور کروں گا“ خُدا بخش نے پُرعزم لہجے میں کہا۔

ہر روز کی طرح اگلی صبح بھی خُدا بخش نے جھولی لٹکائی، بین ہاتھ میں تھامی اور شیش ناگ کی تلاش میں نِکل کھڑا ہوا۔ جانے سے پہلے اُس نے اکبر کو تاکید کی کہ وہ پٹاریوں کے سانپوں کا اچھّی طرح خیال رکھے۔ اکبر نے ”جی اچھّا“ کہا

اور جوگی مطمئن ہو کر اپنی مہم پر روانہ ہو گیا۔

سہ پہر کے وقت اکبر پٹاریوں کو کھول کر سانپوں کو خوراک ڈالنے لگا۔ اُس نے سب سے بڑے سانپ کی پٹاری کھولی تو اُس کی ماں نے آواز دی۔ اُس نے جلدی میں پٹاری کو اچھّی طرح باندھنے کی بجائے صرف اُس کے اوپر ڈھکنا رکھ دیا اور ماں کی بات سُننے چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس پلٹا تو بڑا سانپ پٹاری سے باہر نِکل چُکا تھا۔ وہ سانپ کو پکڑ کر پٹاری میں ڈالنے لگا تو وہ بھاگ کھڑا ہوا۔ اکبر پریشان ہو گیا۔ یہ سانپ اُس کی لاپروائی کی وجہ سے فرار ہوا تھا۔ اُس نے جلدی سے اپنی بین پکڑی اور سانپ کے پیچھے بھاگ کھڑا ہوا۔

سانپ بڑا ہونے کی وجہ سے بہت تیز نہیں بھاگ سکتا تھا مگر اکبر کی رفتار سانپ سے کچھ کم تھی۔ سانپ آگے آگے تھا اور اکبر پیچھے پیچھے۔ وہ بھاگتے بھاگتے کافی دُور نکل گئے۔ جب سانپ تھک گیا تو ایک جگہ جھاڑیوں میں گھُس گیا۔ اکبر ان جھاڑیوں کے قریب بیٹھ کر بین بجانے لگا تاکہ سانپ مَست ہو کر اس کے قریب آ جائے اور وہ اُسے پکڑ لے۔ مگر ایسا نہ ہوا۔ سانپ تھوڑی دیر ستانے کے بعد دوبارہ بھاگ کھڑا ہوا۔ اکبر بھی اُس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔

سُورج غرُوب ہونے کے قریب تھا کہ سانپ ایک بار پھر جھاڑیوں میں گھُس گیا۔ اکبر نے دوبارہ بین بجانا شُروع کر دی۔ اُس نے ابھی تھوڑی دیر ہی بین بجائی تھی کہ جھاڑیوں میں سے ایک سانپ نِکل کر بین کے آگے جھُومنے لگا۔ مگر یہ سانپ وہ نہیں تھا جِس کا وہ پیچھا کر رہا تھا۔ جب سانپ پُوری طرح مَست ہو گیا تو اکبر نے دائیں ہاتھ سے نہایت پُھرتی سے اُس کو گردن سے پکڑ لیا۔ ایسا سانپ اُس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

اکبر یہ سانپ لے کر واپس پہنچا تو اُس کا باپ بھی تھک ہار کر واپس آ گیا تھا۔ اُس نے بیٹے کے ہاتھ میں سانپ دیکھا تو ایک دَم کھڑا ہو گیا۔ اچانک اُس کا پُورا جِسم خوف سے کانپنے لگا۔ اکبر اپنے باپ کی طرف پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھنے لگا کہ آخر اُسے کیا ہو گیا ہے۔ اِس سے پہلے کہ جوگی اپنے بیٹے کو کچھ بتاتا، اُس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور بڑی احتیاط سے سانپ اکبر کے ہاتھ سے لے لیا۔

"اکبر بیٹا، تم نے نادانی میں بہت زہریلا سانپ پکڑا ہے۔ اس سانپ کو پکڑنے کی بڑے بڑے جوگی بھی ہمّت نہیں کرتے" بُوڑھے جوگی نے بتایا تو اکبر کو اپنے آپ پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ کام اُس نے کیا ہے۔

جوگی نے اُس سانپ کو بڑی احتیاط سے پٹاری میں بند کر دیا۔ اب اُن کی قسمت بدل چُکی تھی۔ یہی وہ شیش ناگ تھا جِس کے لیے وہ یہاں آئے تھے۔ جوگی کو ساری رات خوشی سے نیند نہ آئی اور صبح ہوتے ہی وہ شہر کی طرف روانہ ہو گئے

اُس نے غلط نوٹ دُکان دار کو دے دیا

شاہد انور شیرازی، مردان

محمد اکرم صاحب بہت نیک آدمی تھے۔ وہ محلّے کی مسجد میں پیش امام تھے۔ اُن کے تین بچّے تھے۔ دو بیٹے اور ایک بیٹی۔ محمد اکرم صاحب کا معمول تھا کہ رات کو سونے سے پہلے تینوں بچّوں کو گھر کے سب سے بڑے کمرے میں اکٹھا کر لیتے۔ خاندان کے دوسرے افراد بھی وہیں آ جاتے تھے۔ لکھائی پڑھائی سے لے کر کھیل کُود وغیرہ تک تمام باتیں ہوتیں۔ محمد اکرم صاحب کا قاعدہ تھا کہ جہاں کسی بچّے کی کوئی ایسی حرکت اُن کے علم میں آتی جسے وہ پسند نہیں کرتے تھے تو باتوں باتوں میں اُس کو اِس حرکت سے باز رہنے کی تلقین کرتے۔ اچھّے کاموں پر وہ بچّوں کو اِنعام بھی دیتے تھے۔

آج بھی معمول کے مطابق بچّے بڑے کمرے میں اکٹھے ہوئے اور تھوڑی دیر بعد محمد اکرم صاحب تشریف لائے تو سب تعظیم کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ محمد اکرم صاحب نے اُنہیں دُعائیں دیں اور پھر بیٹھنے کو کہا۔

بات چیت شُروع ہوئی تو محمد اکرم صاحب نے بچّوں سے اُن کی دِن بھر کی مصروفیات کے بارے میں دریافت کیا۔ اِسکول میں وقت کیسے گزرا۔ کِس کِس کے ساتھ نیکی کی۔ کیا کیا سبق یاد کیا وغیرہ وغیرہ۔

آج اُن کے بیٹے محمد اشرف سے ایک غلطی سرزَد ہوئی تھی۔ اُس کی ماں نے سودا خریدنے کے لیے اُسے 15 روپے دیئے تھے۔ لیکن جب اُس نے چیزیں خریدیں تو وہ 55 روپے کی تھیں۔ وہ پریشان تھا کہ پانچ روپے کہاں سے لاؤں کہ اُسے یاد آیا کہ اُس کی جیب میں ایک ٹیپ لگا ہوا پانچ روپے کا نوٹ ہے جس کا ایک ٹکڑا ایک نوٹ کا ہے اور دوسرا ٹکڑا دوسرے نوٹ کا۔ اس نے وہ نوٹ دوسرے نوٹوں کے درمیان رکھ کر دُکان دار کو دے دیا۔

یہ واقعہ محمد اشرف نے اپنے والد کو بتایا تو پہلے تو وہ بہت خفا ہوئے، مگر پھر یہ سوچ کر خُوش ہوئے کہ اُس نے اپنی غلطی مان لی اور اس پر وہ پشیمان بھی تھا۔ اُنہوں نے بچّوں کو اِس طرح کے کاموں سے منع کیا اور حضور صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کا وہ واقعہ بیان کیا جس میں ایک تاجر نے حضورؐ سے چند اونٹ خریدے تھے۔ اُنہوں نے کہا:

عرب کے ملک میں، ریگستان ہونے کی وجہ سے، کھیتی باڑی کم ہوتی تھی۔ لوگ عموماً تجارت کیا کرتے تھے۔ ہمارے نبیؐ بھی دوسرے لوگوں کی طرح تجارت کرتے تھے۔ ایک دفعہ حضورؐ کے پاس بہت سے اونٹ جمع ہو گئے تو آپ صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم نے انہیں بیچنا چاہا۔ چند روز بعد اونٹوں کا ایک سوداگر آپؐ کے پاس آیا اور تمام اونٹوں کا سودا کیا۔ اُس نے اونٹوں کی قیمت ادا کی اور اونٹ لے کر منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔

تاجر کے جانے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کو یاد آیا کہ اُن اونٹوں میں ایک اونٹ لنگڑا تھا، اور آپؐ نے اُس لنگڑے اونٹ کی بھی پوری قیمت لے لی تھی۔ حضورؐ نے سوچا کہ اس اونٹ کی پوری قیمت نہیں لینی چاہیئے تھی۔ آپ اُسی وقت گھوڑے پر سوار ہوئے اور تاجر کی تلاش میں نِکلے۔

تھوڑی دُور جا کر وہ تاجر نظر آ گیا۔ حضورؐ نے اُسے روکا اور فرمانے لگے کہ بھائی، اُن اونٹوں میں ایک اونٹ لنگڑا ہے۔ اس وقت مجھے یاد نہیں رہا تھا اور میں نے اس لنگڑے اونٹ کی بھی آپ سے پوری قیمت وصول کر لی تھی۔ وہ اونٹ مجھے واپس دے دیں اور اپنے پیسے لے لیں۔ تاجر نے لنگڑا اونٹ آپؐ کو واپس کر دیا اور اپنے پیسے لے کر چلا گیا۔

محمد اکرم صاحب نے یہ کہانی سُنا کر محمد اشرف سے کہا "بتاؤ، اشرف۔ اس سے ہمیں کیا سبق ملتا ہے؟"

محمد اشرف نے جواب دیا "ابّا جان، اس سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ ہمارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم بہت دیانت دار تھے۔ اِس لیے ہمیں بھی آپ ؐ کی پیروی کرنی چاہئے اور ایمان داری سے لین دین کرنا چاہئے۔ اس سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولِ پاک ؐ خوش ہوتے ہیں۔"

"ہاں، بہت اچھّی بات کہی تم نے۔ تو کل تم اُس دُکان دار کے پاس جاؤ گے اور اس سے معافی مانگو گے۔ اور اگر وہ نوٹ اس کے پاس ہو تو اُس سے واپس لے لینا اور اُسے صحیح نوٹ دے دینا" محمد اکرم صاحب نے بیٹے سے کہا۔

"ابّا جان، میں کل اِن شاء اللہ ضرور اُس کے پاس جاؤں گا، اُس سے معافی مانگوں گا اور آئندہ ایسی حرکت نہیں کروں گا۔" (پہلا اِنعام : 50 روپے کی کتابیں)

بڑوں کا ادب

رابعہ مظہر، فیصل کالونی کراچی

رات کو دیر سے سونے کی وجہ سے اُسامہ کا دِل فجر کی نماز پڑھنے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ لیکن امّی کے بار بار اُٹھانے پر اُسے اٹھنا ہی پڑا۔ اِسکول میں بھی اُس کا دِل اُچاٹ اُچاٹ سا رہا۔ اور پھر سونے پر سُہاگہ یہ کہ حساب کا کام پُورا نہ کرنے پر سَر رشید نے اُسے سزا کے طور پر کھڑا کر دیا جِس سے وہ اور چڑچڑا ہو گیا۔

گھر آتے ہی اُس نے بستہ ایک طرف پھینکا اور جوتوں سمیت بستر پر پڑ کر سو گیا۔ اُس کی امّی نے اُسے گھر میں داخل ہوتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ وہ اُس کے لیے کھانا لے کر آئیں اور سوتا ہوا دیکھا تو کھانا واپس لے گئیں۔ شام کو جب اس کی آنکھ کھُلی تو دوپہر کا کھانا نہ کھانے کی وجہ سے اُسے بڑے زور کی بھوک لگ رہی تھی۔ اُس نے جلدی جلدی منہ ہاتھ دھویا اور کچھ کھانے کے لیے باورچی خانے میں جھانکا تو امّی رات کے کھانے کی تیاری میں مصروف نظر آئیں۔

امّی نے اُسے جھانکتے ہوئے دیکھا تو اندر آکر بیٹھنے کو کہا اور پھر چائے اور بسکٹ کھانے کو دیئے۔ وہ تھوڑی دیر بعد کام سے فارغ ہو کر اُس کے ساتھ بیٹھ کر چائے پینے لگیں۔ اِس کے بعد اُنھوں نے پُوچھا کہ کیا بات ہے بیٹا، آج تمہارا کیوں خراب ہو رہا تھا۔ تم دوپہر کا کھانا کھائے بغیر ہی سو گئے۔ امّی کے پوچھنے پر اُسامہ سَر رشید کو بُرا بھلا کہنے لگا کہ میں ہمیشہ اِسکول کا کام مُکمّل کرتا ہوں۔ بس ایک دن کام کر کے نہیں لے گیا تو سَر نے مجھے بھی نکمّے لڑکوں کے ساتھ کھڑا کر دیا۔

اُسامہ کی پُوری بات سُننے کے بعد امّی نے اُس سے ہوم ورک مُکمّل نہیں کرنے کی وجہ پُوچھی تو اُس سے کوئی معقول جواب نہ بن پڑا۔ امّی نے دیکھا کہ اُسامہ کو اپنی غلطی کی وجہ سے سزا ملی ہے تو سَر کی بُرائی کرنے پر اُس کو سرزنش کی اور پھر پیار سے سمجھایا کہ بیٹا، تمہیں ہر حالت میں اپنے اُستادوں کا اور بڑوں کا ادب کرنا چاہئے۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے بولیں، اچھّا تم نے حضرت امام حسن ؓ اور حضرت امام حُسین ؓ کے بچپن کا وہ واقعہ سُنا ہے جِس سے بڑوں کا ادب کرنے کا سبق ملتا ہے"؟ اُسامہ کے اِنکار کرنے پر امّی نے اُسے وہ واقعہ سُنانا شُروع کیا:

یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ حضرت امام حسن ؓ اور حضرت امام حُسین ؓ ہمارے پیارے رسول صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کے نواسے تھے۔ دونوں بھائیوں کو نماز پڑھنے کا اتنا شوق تھا کہ وقت سے پہلے ہی مسجد میں چلے جاتے تھے اور اس طرح انہیں جماعت میں سب سے آگے کی صف میں جگہ مل جاتی تھی۔ لیکن ایک بزرگ صحابی ؓ اُن کو بچّہ ہونے کی وجہ سے پیچھے کھڑا کر دیتے تھے اور اُن کی جگہ دوسرے نمازیوں کو دے دیتے تھے۔ دونوں بھائیوں کو یہ بات ناگوار تو گزرتی لیکن صحابی کی بزرگی کا احترام کرتے ہوئے کبھی شکایت نہیں کرتے تھے۔ لیکن ایک دفعہ جب اُنھوں نے دیکھا کہ وہی صحابی ؓ جو اُنہیں اگلی صف سے ہٹا دیتے ہیں، غلط طریقے سے وضو کر رہے ہیں تو وہ بڑے پریشان ہوئے۔ چھوٹے ہونے کی وجہ سے وہ اُنہیں ٹوک بھی نہیں سکتے تھے کہ وہ صحیح طریقے سے وضو کریں۔

آخر اُنھوں نے آپس میں صلاح مشورہ کر کے اِس

مسئلے کا حل ڈھونڈ ہی نکالا۔ ان صحابیؓ کے پاس جا کر کہنے لگے کہ محترم، معلوم ہوتا ہے کہ ہم وضو کرنے میں کچھ غلطی کرتے ہیں۔ مہربانی کر کے ہمارے وضو کرنے کے طریقے کی اصلاح کر دیں۔ اُن صحابیؓ نے فرمایا "اچھا، ٹھیک ہے۔ تم دونوں میرے سامنے وضو کرو۔ میں تمہاری غلطی کی نشان دہی کر دوں گا"۔

دونوں بھائی وضو کرنے لگے۔ وہ صحابیؓ اُنہیں غور سے دیکھ رہے تھے۔ اُنہیں احساس ہوا کہ یہ بچّے تو وضو صحیح کرتے ہیں، میں ہی غلطی کر جاتا ہوں۔ اُن صحابیؓ نے بڑے ہونے کے باوجود اپنی غلطی کو تسلیم کر لیا، اپنے وضو کرنے کے طریقے کی اصلاح کر لی، اور پھر کبھی اُنہیں اگلی صف میں کھڑا ہونے سے منع نہیں کیا۔

اتنا کہنے کے بعد اُسامہ کی امّی خاموش ہو گئیں۔ اُسامہ کو اپنے رویئے پر بڑی شرمندگی ہوئی اور اُس نے امّی سے وعدہ کیا کہ آئندہ وہ بڑوں کا ادب کرے گا اور حضرت امام حسنؓ اور حضرت امام حُسینؓ کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کرے گا۔ (دوسرا انعام: 45 روپے کی کتابیں)

چوری کی دوا

محمد علی، رشید آباد کراچی

"بیٹے، تمہارے ابّا کی طبیعت خراب ہوتی جا رہی ہے" شادمان کی امّی نے اُس سے کہا۔

"امّی، ڈاکٹر صاحب کی ہدایت کے مطابق دوا دے رہا ہوں۔ نہ جانے کیوں آرام نہیں آ رہا" شادمان بولا۔

"آج کل دوائیں بھی تو نقلی آ رہی ہیں، بیٹے" امی نے کہا۔

"آج ڈاکٹر صاحب سے پتا کروں گا"

یہ کہہ کر شادمان باہر نکل گیا۔ وہ ایک کمپونڈر تھا اور گھر کے قریب ہی ایک کلینک میں کام کرتا تھا۔ پچھلے کئی روز سے اُس کے ابّو کی طبیعت خراب تھی۔ وہ دوسرے مریضوں کے نسخوں کے مطابق کلینک سے دوائیں اٹھا کر لے آتا اور ابّو کو دے دیتا۔ وہ یہ کام ڈاکٹر صاحب کی اجازت کے بغیر کرتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب سے پوچھتا تو وہ دواؤں کی قیمت وصول کرتے۔ دوسرے معنوں میں شادمان چوری کی دوائیں ابّو کو کھلاتا تھا جس سے اُن کی طبیعت ٹھیک ہونے کے بجائے خراب ہوتی جا رہی تھی۔

آج بھی اُس نے ڈاکٹر صاحب سے ایک مرض کی دوا پوچھی اور کلینک سے چُرا کر گھر لے آیا تاکہ ابّو کو دے سکے۔ وہ دوا اُس کے ابّو نے لی تو اُنہیں فوراً ہی قے ہو گئی۔ شادمان اور اُس کی امّی کے ہاتھ پاؤں پھُول گئے۔ شادمان بھاگا بھاگا ڈاکٹر صاحب کے پاس پہنچا اور اُنہیں بتایا کہ اُس کے ابّو کی طبیعت بہت سخت خراب ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو تشویش ہوئی۔ وہ فوراً شادمان کے ساتھ اُس کے گھر پہنچے اور اُس کے ابّو کو چیک کیا۔ پھر چند دوائیں لکھ کر شادمان کو دیں۔ شادمان نے دیکھا کہ یہ وہی دوائیں تھیں جو وہ دوا خانے سے چُرا کر اپنے ابّو کو دیتا رہا تھا۔

اُس نے ڈاکٹر صاحب سے کہا "ڈاکٹر صاحب، میں یہ دوائیں ابّو کو پہلے بھی دیتا رہا ہوں۔ اس سے تو ان کی طبیعت اور زیادہ خراب ہو گئی ہے۔"

ڈاکٹر صاحب نے شادمان کو دیکھا اور نرمی سے بولے "شادمان، دوا میں شفا نہیں ہوتی، شفا اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ جو دوائیں تم نے اپنے ابّو کو دیں، وہ تم مجھ سے پوچھے بغیر کلینک سے لاتے تھے، اِس لیے اللہ تعالیٰ تم سے ناراض ہو گئے، اور جب خُدا ناراض ہو تو شفا کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ بیٹے، تم نے غلط طریقہ اختیار کیا۔ اب جو دوائیں تم لاؤ گے، اُن کی باقاعدہ قیمت ادا کرو گے۔ مجھے اُمّید ہے تمہارے ابّو بہت جلد صحت یاب ہو جائیں ہیں۔"

اپنی پول کھل جانے پر شادمان بہت شرمندہ ہوا اور اُس نے آئندہ چوری سے توبہ کر لی۔ (تیسرا انعام: 40 روپے کی کتابیں)

ڈھینچو، ڈھینچو

ریحانہ سرور زئی، لالہ رُخ

آج خلافِ معمول چاچا کرمو کا گدھا چِلّائے جا رہا تھا،

چلّائے جا رہا تھا۔ کچھ دیر تو چاچا کرمو نے برداشت کیا لیکن جب وہ کسی طرح نہیں مانا تو اس کی ڈنڈے سے ٹھکائی کرنے لگے۔

چاچا کرمو ہمارے محلے کے سب سے آخری مکان میں رہتے ہیں اور بزرگ ہونے کی وجہ سے سب لوگ اُن کی عزّت کرتے ہیں۔

ہمیں چاچا کرمو اور گدھے کی آواز کم ہی سُنائی دے رہی تھی، اِس لیے ہم نے زیادہ غور نہیں کیا۔ لیکن جب سلمٰی باجی نے آکر بتایا کہ مُحلّے کے سب لوگ گدھے کے رینگنے کی وجہ سے پریشان ہیں تو ہم نے بھی کتابیں بند کیں اور باہر نکل گئے۔

باہر کا منظر کچھ عجیب سا تھا۔ سب لوگ جمع تھے اور گدھا مسلسل چیخے جا رہا تھا۔ چاچا کرمو بہت پریشان تھے اور طرح طرح کے طریقے آزما رہے تھے۔ لیکن گدھا تھا کہ چُپ ہونے میں نہ آتا تھا۔ آخر میں نے سوچا کہ کیوں نہ اپنا طریقہ آزمایا جائے۔ میں ہجوم کو چیرتا ہوا آگے بڑھا، گدھے کے پاس پہنچ کر کچھ پڑھا اور پھر اُس پر پھونک دیا۔ میرا پھونکنا تھا کہ گدھا ایک دم چُپ ہو گیا۔ یہ دیکھ کر سب لوگ حیران رہ گئے اور ہم ذرا اور اکڑ گئے کیوں کہ تھوڑی بہت اکڑ تو ہم میں پہلے ہی موجود تھی۔

کافی داد وصول کرنے کے بعد ہم نے چچا کرمو کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا۔ جب وہ قریب پہنچے تو ہمارے سر پر ہاتھ پھیر کر بولے "بیٹا، تم نے تو کمال کر دیا۔ میں نے گدھے پر ہر طریقہ آزمایا تھا۔ پیار بھی کیا، مارا بھی، پانی بھی اس کے آگے رکھا، لیکن وہ تو ایسا شروع ہوا کہ چُپ ہونے کا نام نہ لیتا تھا۔ تم نے کیا کیا جو یہ ایک دَم خاموش ہو گیا؟"

جب ہر طرف سے ایسے سوال ہونے لگے تو ہم نے اُنہیں بتایا کہ اگر گدھا رینگ رہا ہو تو تعوذ یعنی اعوذُ بِاللہ پڑھنی چاہئے۔ اِس لیے کہ گدھا شیطان کو دیکھ کر چیختا ہے اور تعوذ پڑھنے سے شیطان بھاگ جاتا ہے۔ سب لوگوں نے ایک بار پھر ہمیں شاباش دی اور ہم داد وصول کرتے ہوئے گھر واپس آ گئے۔

اگر آپ کو بھی کبھی ایسا واقعہ پیش آئے تو ہماری بات پر عمل کیجئے گا۔ شیطان کو بھگانا ویسے بھی بہت اچھّی بات ہے۔

(چوتھا اِنعام: 35 روپے کی کتابیں)

پہلی تقریر

Sharjeel Ahmed

اِنعامُ الحق، واہ کینٹ

اُن دِنوں ہمارے اِسکول میں ایک تقریری مقابلہ ہونے والا تھا۔ موضوع کو آسان اور دِلچسپ دیکھ کر میں نے سوچا میں بھی اِس میں حِصّہ لوں۔ یہ سوچ کر میں نے جلدی سے تقریر لکھی اور اپنے اُستادوں کو دِکھائی۔ اُنہوں نے بڑی تعریف کی اور پھر جناب ہم نے وہ اہم کام شُروع کیا جسے عام طور پر اِسکول کے طالب علم رٹّا کہتے ہیں۔ کبھی گھر کے باغ میں ٹہل کر، کبھی اپنے بستر پر اور یقین جانئے کبھی خواب میں تقریر یاد کرنے لگے۔ بعض دوست ہمیں دیکھ کر مسکراتے اور کہتے کہ اِنعامُ الحق ضرور اِسکول پلیٹ فارم پر جھنڈے گاڑ کر آئے گا۔

اب ہماری تقریر میں اچھّی خاصی روانی پیدا ہو چکی تھی۔ ہم درختوں اور پودوں کو حاضرین بنا کر، خوب ہاتھ نچا نچا کر، تقریر کرتے۔ شیشے کے سامنے کھڑے ہو کر عجیب عجیب پوز بناتے۔

آخر خُدا خُدا کر کے وہ دِن آیا جس کا ہمیں انتظار تھا۔ اِسکول کا ہال لڑکے اور لڑکیوں سے بھرا ہوا تھا۔ ہم دھڑکتے دِل کے ساتھ مقرروں کی قطار میں صدر صاحب کے بائیں طرف اسٹیج پر بیٹھ گئے۔ اِس وقت ہمیں کچھ ہوش نہ تھا کہ ہم کہاں ہیں اور یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ صرف صدر کی صورت نظر آ رہی تھی، اور دِماغ میں تقریر کے مختلف جُملے بے ترتیبی سے چکّر کاٹ رہے تھے۔ ابھی اِنہی خیالوں میں تھے کہ اُستاد صاحب نے بڑی بے رحمی کے ساتھ اِعلان کیا "اب آپ کے سامنے اِنعام صاحب اپنے خیالات کا اظہار کریں گے۔"

اِن الفاظ کا ہمارے دِل پر ایٹم بم سے بھی زیادہ اثر ہوا۔ خیر بہ مشکل اپنے حواس کو قابو میں کرتے ہوئے ڈائس تک

پہنچے۔ ہم نے مائک کو اِس طرح پکڑ رکھا تھا جیسے وہ ہمارے ہاتھ سے چھوٹا تو ہم گئے کام سے۔

آخر تالیوں کا شور سُن کر ہم نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور بڑی مشکل سے گردن موڑ کر کہا "جنابِ صدر!" ہمارا یہ کہنا تھا کہ ایک فرمائشی قہقہہ پڑا۔ ہم حیران کہ یہ قِصّہ کیا ہے؟ او ہو! اب سمجھ میں آیا۔ جنابِ صدر تو دائیں طرف بیٹھے تھے اور ہم گھبراہٹ میں بائیں جانب دیکھ رہے تھے۔

خیر، جناب۔ بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھالا اور لڑکوں کے خاموش ہوتے ہی اس رفتار سے بولنا شُروع کیا جس رفتار سے سُپر ایکسپریس چلتی ہے۔ جو الفاظ ہمارے دِماغ میں تھے، وہ سب ہم نے اُگل دِیے۔ حاضرین کا اس وقت کیا حال تھا؟ اس کا ہمیں علم نہیں۔ ہاں البتہ اتنا ضرور یاد ہے کہ جس طرف ہماری نظر گئی، وہاں ہم نے ہنستے ہوئے چہرے دیکھے۔

تقریر ختم ہوتے ہی ہم گولی کی طرح اپنی سیٹ کی طرف دوڑے اور پھر کیا ہوا؟ یہ آپ نہ ہی پوچھیں تو اچھا ہے۔ سمجھ دار ہیں تو ضرور سمجھ جائیں گے۔

(پانچواں اِنعام: 30 رُوپے کی کتابیں)

نقل

محمد امین تبسم، عارف والا

میرے ماموں احمد صاحب کو طالب علمی کے زمانے میں کہانیاں لکھنے کا بہت شوق تھا اور اُن کی کہانیاں بچّوں کے رسالوں میں چھپتی رہتی تھیں۔ ایک دن ہم نے اُن سے پُوچھا کہ آپ کو کہانی لکھنے کا شوق کیسے ہوا تو وہ کچھ دیر سوچتے رہے، پھر کہنے لگے:

یہ 1955ء کی بات ہے، جب میں آٹھویں کلاس کا طالب علم تھا۔ ایک روز ہمارے اُردو کے ٹیچر عبیداللہ صاحب اپنا پیریڈ پڑھانے آئے تو اُنھوں نے ہمیں بتایا کہ اس بار 14 اگست کے موضوع پر بچّوں کو کہانیاں لکھنی ہیں اور 14 اگست میں صرف 12 دن رہ گئے ہیں۔ اول، دوم اور سوم آنے والے بچّوں کو اِنعام دیا جائے گا۔

میں اور میرے دوست رفیق نے فیصلہ کیا کہ ہم بھی اس مقابلے میں حِصّہ لیں گے۔ چُناں چہ گھر جاتے ہی میں نے کہانی لکھنا شُروع کر دی۔ لیکن کوئی بات ذہن میں آ ہی نہیں رہی تھی۔ رفیق بہت ہوشیار اور لائق تھا۔ اس نے کہانی دو ہی دن میں لکھ لی لیکن میرے کھوکھلے دِماغ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

آخر سوچتے سوچتے مجھے ایک ترکیب سوجھی۔ میں نے باجی کے کمرے سے ایک پُرانا رسالہ لیا اور اس کے ورق اُلٹ پُلٹ کرنے لگا۔ اچانک میری نظر ایک کہانی پر پڑی جو 14 اگست کے مُتعلّق ہی تھی۔ میں بہت خُوش ہوا اور مجھے یقین ہو گیا کہ اب میں اِنعام جیت کر ہی رہوں گا۔

اِس کے بعد میں نے رسالے سے کہانی نقل کرنا شُروع کر دی۔ ابھی چند سطریں ہی لکھی تھیں کہ رفیق آ گیا۔ اس نے مجھے نقل کرتے دیکھا تو ناراض ہو کر کہنے لگا "تمھیں اپنے آپ پر اعتماد نہیں ہے؟ اپنے ذہن پر زور دو۔ مجھے یقین ہے کہ تم ضرور لکھنے میں کامیاب ہو جاؤ گے۔"

میں یہ سُن کر بہت شرمندہ ہوا اور دِل میں پُختہ اِرادہ کر لیا کہ اب میں خود اپنے دِماغ سے سوچ کر کہانی لکھوں گا۔ کچھ دیر بعد رفیق چلا گیا اور میں کہانی کا پلاٹ سوچنے لگا اور آخر ایک اچھّی سی کہانی لکھنے میں کامیاب ہو گیا۔ جب رفیق نے وہ کہانی پڑھی تو بہت خُوش ہوا۔

آخر کار 14 اگست کا دِن آ گیا اور جن بچّوں کو مقابلے میں حِصّہ لینا تھا اُنھوں نے اپنی کہانیاں پرنسپل صاحب کو دے دیں۔ کہانیاں تو سبھی بہترین تھیں لیکن میری، رفیق کی اور میرے ایک اور ہم جماعت کی کہانیاں پہلے، دوسرے اور تیسرے نمبر پر آئیں۔ اس کے بعد میں نے کبھی نقل نہیں کی۔

ہم نے جب اُن سے یہ واقعہ سُنا تو ہم نے بھی پُختہ اِرادہ کر لیا کہ ہم بھی کبھی نقل نہیں کریں گے۔

(چھٹا اِنعام: 25 روپے کی کتابیں)

وہ نگاہوں سے لوہے کو موڑ دیتا ہے!

قُدرت بعض لوگوں کو ایسی طاقت عطا کرتی ہے جو عام لوگوں میں نہیں ہوتی۔ اِسے فوقُ الفطرت (سُپر نیچرل) طاقت کہتے ہیں۔

کچھ عرصہ پہلے ہم نے آپ کو ایک ایسی چینی عورت کے بارے میں بتایا تھا جس کی آنکھیں ایکس رے مشین کا کام کرتی ہیں۔ وہ مریض کے جسم پر ایک نظر ڈال کر یہ بتا دیتی ہے کہ اُس کے اندر کون سا عضو خراب ہے۔ فلپائن کی ایک عورت بغیر کسی نشتر کے، صرف اُنگلی سے، پھوڑے پھُنسی کا آپریشن کر دیتی ہے۔ بعض لوگوں کے خیال میں اِتنی طاقت ہوتی ہے کہ وہ جس چیز کو چاہیں زمین سے اُٹھا کر ہوا میں اُڑا سکتے ہیں۔

ایک اِسرائیلی نوجوان، یُوری گیلر، کی نگاہوں میں اِتنی زبردست طاقت ہے کہ وہ دھات کے چمچوں، کانٹوں اور ایسی ہی دوسری چیزوں کو اپنی نظروں سے توڑ یا موڑ دیتا ہے۔ وہ کئی مرتبہ اِسرائیلی ٹی وی پر یہ کارنامہ دِکھا چکا ہے، اور جگہ جگہ اِسٹیج شو بھی کرتا ہے۔ وہ میز پر دھات کی کوئی چیز رکھ کر تماشائیوں سے کہتا ہے کہ اِسے اچھی طرح دیکھ لیں۔ جب تماشائی اچھی طرح تسلّی کر لیتے ہیں تو یُوری گیلر اُس چیز کو غور سے دیکھتا ہے اور چند سکنڈ میں وہ چیز ٹوٹ جاتی ہے یا مُڑ جاتی ہے۔ اُس نے اپنی اِس خداداد طاقت سے لاکھوں روپیہ کمایا ہے۔

جن سائنس دانوں نے یُوری گیلر کا مُعاینہ کیا ہے، اُن کا کہنا ہے کہ اُس کا یہ عجیب و غریب "کرشمہ" خدا کی دین ہے۔ اِس کی کوئی وجہ نہیں بتائی جا سکتی۔

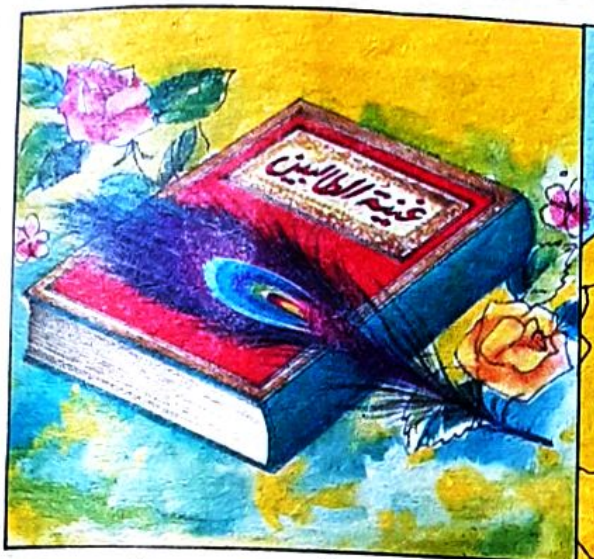

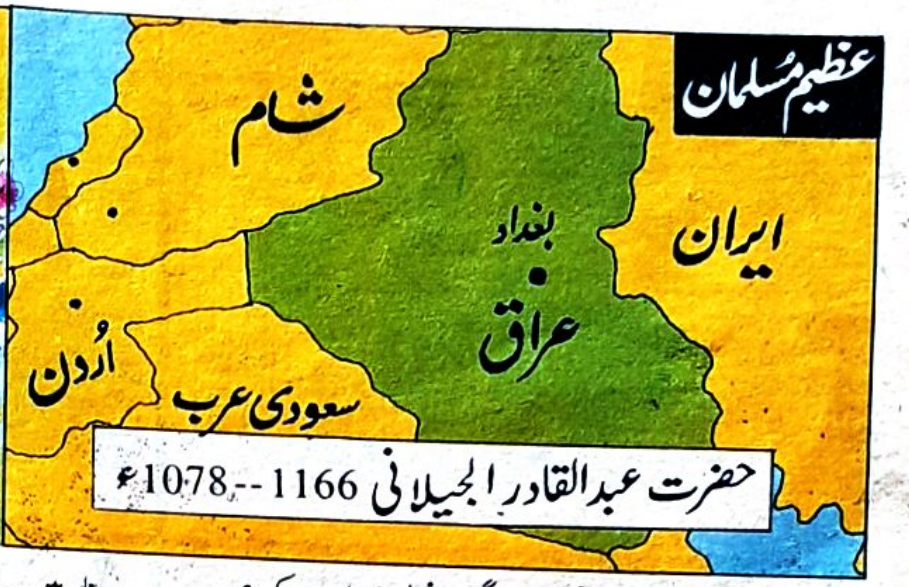

عظیم مسلمان

حضرت عبدالقادر الجیلانی 1078--1166ء

عالم اسلام کے یہ مشہور بزرگ شمالی ایران کے صوبہ جیلان میں ایک ولی اللہ حضرت ابو صالح موسیٰ کے ہاں پیدا ہوئے۔ عام طور پر لوگ عقیدت سے انہیں پیران پیر اور حضرت غوث الاعظم کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ آپ کے والد آپ کے بچپن میں ہی وفات پا گئے تھے اسی لئے آپ کی والدہ آپ کو اپنے والدین کے پاس لے گئی اور وہیں آپ کی پرورش کی۔ آپ نے اپنی ابتدائی تعلیم بھی وہیں حاصل کی۔ اٹھارہ سال کی عمر میں آپ نے اپنی ابتدائی تعلیم ختم کر لی اور پھر مزید تعلیم کے لئے بغداد جانے کا ارادہ کیا۔ والدہ نے کہا کہ مجھے آپ کی جدائی تو گوارہ نہیں لیکن مسئلہ آپ کی تعلیم اور بہتری کا ہے۔ اس لئے مجبوراً اجازت دے دیتی ہوں شائد زندگی میں پھر آپ کی شکل دیکھنا نصیب نہ ہو۔ یہ کہہ کر اپنے بیٹے کو کہا کہ میرے پاس تو تمہارے سفر خرچ کے لئے کوئی رقم نہیں ہے۔ فوت ہوتے وقت تمہارا باپ اسی دینار چھوڑ گیا تھا ان میں سے چالیس دینار تمہارے بھائی کے لئے رکھ لیتی ہوں اور چالیس دینار تم لے جاؤ۔ یہ کہہ کر وہ چالیس دینار اس کے کرتے میں چھپا کر سلائی کر دیئے۔

خدا کا کرنا کیا ہوا کہ جس قافلے کے ساتھ آپ سفر کر رہے تھے راستے میں اس پر ڈاکوؤں نے حملہ کر دیا اور سب مال و دولت اور اسباب لوٹ لیا۔ ڈاکوؤں کا سردار جب آپ کے پاس سے گزرا تو خستہ حالت کا لباس دیکھ کر چھوڑ دیا اور آگے گزر گیا پھر ایسے ہی جاتے جاتے پوچھا کہ اے نوجوان! تمہارے پاس بھی کچھ ہے۔ آپ نے جواب دیا ہاں! چالیس دینار ہیں۔ ڈاکوؤں کے سردار کو تعجب ہوا اور پوچھا کہاں ہیں؟ آپ نے کرتے کا وہ حصہ دکھا دیا جہاں وہ دینار چھپا کر سلائی کئے ہوئے تھے۔ ڈاکوؤں کا سردار اس بات پر حیران ہوا اور کہا کہ اے لڑکے! جب یہ اس طرح چھپائے ہوئے تھے کہ کسی کو پتہ نہیں چل سکتا تھا تو پھر تو نے کیوں بتایا۔ آپ نے کہا کہ چلتے وقت میری ماں نے مجھے نصیحت کی تھی کہ بیٹا زندگی میں ہمیشہ سچ بولنا۔ تو میں اپنی ماں کی نصیحت کو نہیں بھول سکتا۔ اس پر ڈاکوؤں کے سردار پر اتنا اثر ہوا کہ اس نے سب قافلے والوں کا مال لوٹا دیا اور آئندہ اپنی تمام زندگی عبادت میں گزارنے کا تہیہ کر لیا اور آخر بزرگی کو پہنچا۔

آپ بغداد پہنچے اور وہاں کے عالموں اور خدا رسیدہ بزرگوں سے تعلیم حاصل کی اور اپنی باقی ماندہ زندگی رشد و ہدایت میں گزار دی۔ آپ کے بارے میں مشہور ہے کہ آپ کی تقریر میں اتنا اثر تھا کہ بے شمار غیر مسلموں نے آپ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا آپ نے مسلمانوں کی ہدائت کے لئے کئی ایک کتابیں لکھیں جن میں "غنیۃ الطالبین" اور "فتوح الغیب" زیادہ مشہور ہیں۔ آپ لوگوں کو اکثر ہدائت کرتے تھے کہ اے لوگو! اللہ تعالیٰ سے ہمیشہ ڈرتے رہو۔ اللہ کے سوا کسی دوسرے کے آگے ہاتھ نہ پھیلاؤ۔ اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھروسہ رکھو وہی سب مرادیں بر لانے والا ہے۔

1078ء میں آپ بیمار پڑے اور لوگوں کو آخری نصیحت و ہدائت کر کے اللہ کو پیارے ہو گئے آپ کو وہیں بغداد میں دفنا دیا گیا۔

عین الحق فرید کوٹی

The Taleem-o-Tarbiat, Lahore
P. L. No. 4756
ISSN 969 0039 9175
PAKISTAN'S MOST WIDELY READ URDU MAGAZINE FOR CHILDREN OF ALL AGES
Price Rs. 9.00

نامور ناول نگار جناب طارق اسمٰعیل ساگر کی

کیپٹن علی سیریز

قدم قدم پر ایڈونچر، تحیّر
حُبّ الوطنی اور مزاح سے بھرپور

کیپٹن علی اور اُن کے ساتھیوں عامر اور ٹیپو
کے شاندار کارناموں کی کہانیاں
ہر ناول مکمّل کہانی جسے آپ
مکمّل پڑھے بغیر نہیں رہ سکیں گے۔

اِس سیریز کے دس ناول ہیں

1. چکّر پہ چکّر
2. دیوتا کی موت
3. خلاؔ کی آفت
4. بلیک میلر
5. کمانڈو اٹیک
6. روشنی کا راز
7. خطرناک بُوڑھا
8. اُلّو کا ہنگامہ
9. موت کی پُکار
10. خوں خوار بھیڑیا

فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
لاہور۔ راولپنڈی۔ کراچی